اسلام

اور

انتہا پسندی

Islam & Extremism

مولانا وحید الدین خاں

PTF

E-mail: fathima-sarah@hotmail.com
positivethinkersforum@rediffmail.com

اسلام اور انتہا پسندی

مولانا وحید الدین خاں

First Published 2025

Islam Aur Inteha Pasandi
By Maulana Wahiduddin Khan

This book is copyright free

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, Delhi NCR, India
info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, India
Mob. +91-9999944119
info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Centre for Peace and Spirituality USA
391, Totten Pond Road,
Suite 402, Waltham MA 02451, USA
Mob. +1 617 960 7156
info@cpsusa.net

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

یہ اختلاف 3

غلو کیا ہے 5

مذہبی انتہا پسندی 7

ایک آیت 10

بے معنی مسائل 11

شدت پسندی نہیں 13

ناقابلِ معافی 16

بے فائدہ باتیں 18

فتویٰ ایکٹوزم یا ایجوکیشنل ایکٹوزم 20

فتویٰ کا غلط استعمال 26

کلچرل ہیریٹیج کا پریزرویشن 30

کفر اور کافر کا مسئلہ 39

داعی اور مدعو کا رشتہ 43

کافر کا مفہوم 47

فعل اور فاعل کا فرق 49

کریڈٹ کا مسئلہ 51

کفر کا تحقق 52

کفر کی اصطلاح 54

چند تاریخی مثالیں 56

قریش کی مثال 59

مناظرہ 60

دارالدعوہ 61

ٹیلی ویژن کا استعمال 63

غلو کی حقیقت 68

غلو نہیں 70

دین میں غلو 72

جوابی مذہبیت 74

عمر ضائع کردی 76

سوال وجواب 78

یہ اختلاف

ہفتہ وار ”انکشاف“ (جھانسی 21 دسمبر 1983ء) میں ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا:

یہ سنیوں کی مسجد ہے۔

یہ شیعوں کی مسجد ہے۔

یہ اہل حدیث کی مسجد ہے۔

یہ بریلویوں کی مسجد ہے۔

یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔

یہ مسجد بساطیان ہے۔

یہ مسجد منصوریان ہے۔

اس مسجد میں سلام پڑھنا منع ہے۔

اس مسجد میں تبلیغی جماعت قیام نہیں کرسکتی۔

میں ایک نومسلم ہوں۔ قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب کوئی مجھے بتائے کہ میں کس مسجد میں نماز ادا کروں۔

یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسلمان ہر طرف جھوٹے نعروں میں الجھے ہوئے ہیں اور خود ساختہ مسائل کی بنیاد پر انھوں نے خدا کے ایک دین کو بہت سے دینوں میں بانٹ رکھا ہے۔

ایک شخص اپنے جسم کے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے 72 ٹکڑے کر ڈالے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے۔ مگر جن لوگوں نے خدا کے دین کو متفرق کر کے اس کو 72 کے ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے وہ پاگل ہی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ایسے لوگ دینداری کا انعام نہیں پاسکتے۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کو بگاڑنے والا قرار دے کر آخرت میں ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

موجود زمانے میں مسلمانوں کا جو حال ہے، وہ اس آیت کا مصداق ہے جو قرآن میں یہود یوں کے بارے میں آئی تھی: فَتَقَطَّعُوٓاْ أَمۡرَهُم بَيۡنَهُمۡ زُبُرٗاۖ كُلُّ حِزۡبِۭ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُونَ (23:53)۔ یعنی، انہوں نے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اس پر خوش ہے۔

(الرسالہ، مئی 1984)

غلو کیا ہے

غلو کا لفظی مطلب ہے انتہا پسندی (extremism)، یعنی کسی حکم شرعی میں مطلوب حد سے تجاوز کرنا۔ حد سے تجاوز کرنے کی یہ سوچ کب پیدا ہوتی ہے۔ یہ دراصل شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis) کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی جس چیز پر جتنا زور دینا چاہیے، اس پر اس سے زیادہ زور دینا۔ مثلاً اسلام میں سیاست کا مقام صرف جزئی یا اضافی ہے، مگر اس کو اتنا بڑھانا کہ

سیاست ہی کی بنیاد پر پورے دین کی تعبیر وتشریح کی جائے، یہ حد سے تجاوز کرنا ہے اور اس تجاوز کو غلو کہا جائے گا۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ آپ دعوت اور متعلقات دعوت پر اتنا زور دیتے ہیں، وہ بھی غلو کی تعریف میں آتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہر گز نہیں۔ دعوت الی اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر کی اہم ترین سنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کی بعثت ہی اس کے لیے ہوئی۔ مگر موجودہ زمانے میں یہ ہوا کہ مدعو قوموں کو مسلمانوں نے اپنا رقیب یا حریف (rival) سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کے اندر دعوت کا محرک (incentive) ختم ہو گیا۔ اس لیے ہم اس سنت نبوی کو زندہ کرنے کے لیے اس پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کو ایمفیسس (emphasis) کہا جائے گا، نہ کہ شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis)۔

غلو کبھی اصل دین میں نہیں ہوتا، غلو جب بھی ہوتا ہے، وہ ظواہر دین میں ہوتا ہے۔ اصل دین میں شدتِ بیان ہمیشہ مطلوب ہوتی ہے۔ اصل دین میں یہ شدتِ بیان خود قرآنی اسلوب ہے، اور یہی اسلوب ہم کو احادیث میں ملتا ہے۔

اصل دین میں شدتِ بیان کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے آدمی کے اندر روحِ دین زندہ ہوتی ہے، اور روحِ دین کے زندہ ہونے سے دین کے تمام پہلو اپنے آپ زندہ ہوجاتے ہیں۔ روح دین میں شدت کا طریقہ ہی مطلوب طریقہ ہے، البتہ جو ظواہر دین ہیں، ان میں شدت کے بجائے نرمی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اسی فرق کو جاننے کا نام حکمتِ دین ہے۔ (الرسالہ، دسمبر 2014)

مذہبی انتہا پسندی

مذہبی انتہا پسندی (religious extremism) کیا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی دراصل دورِ زوال کا ایک ظاہرہ ہے۔ کوئی امت جب بعد کے زمانے میں زوال (degeneration) کا شکار ہوتی ہے تو اُس وقت امت کے اندر وہ چیز پیدا ہوجاتی ہے جس کو مذہبی انتہا پسندی کہا جاتا ہے۔ زوال کا تعلق فطرت کے ایک قانون سے ہے۔ اِس میں کسی امت کا کوئی استثنا نہیں۔

موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ اپنے دورِ زوال میں ہے، اور زوال کے دوسرے مظاہر کی طرح اس کے اندر مذہبی انتہا پسندی آچکی ہے۔ قرآن اور حدیث میں مذہبی انتہا پسندی کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ غلو ہے۔ کسی امت کی بعد کی نسلوں میں جب زوال آتا ہے تو اُس وقت فطری قانون کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ امت کے افراد میں دین کی اسپرٹ ختم ہوجاتی ہے۔ اُن کے درمیان صرف دین کا فارم باقی رہتا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی دراصل مبنی بر فارم مذہب کا دوسرا نام ہے۔

کسی امت کے دورزوال میں جب مبنی بر فارم مذہب کا رواج ہوجائے تو ایسا ہوتا ہے کہ دین کے ہر معاملے میں ظواہر کو اہم سمجھ لیا جاتا ہے۔ اُس

وقت فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن میں صحتِ تلفظ کو ساری اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ عبادت کے معاملے میں خشوع کے بجائے ارکان کی ادائیگی کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ دینی احکام کے معاملے میں ساری بحث اس کے فنی پہلوؤں پر مرتکز ہوجاتی ہے۔ اسلامی زندگی کا مطلب یہ بن جاتا ہے کہ ایک ظاہری شناخت (identity) کو اختیار کرلیا جائے۔ اسلامی دعوت کا مطلب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مروجہ سیاسی نظام کو توڑ کر اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلامی حکومت کا مطلب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بالجبر لوگوں کے اوپر شرعی حدود قائم کی جائے۔ اسلامی مفاد کا مطلب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ تمام قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر اُن کے خلاف نفرت اور تشدد کا ہنگامہ کیا جائے، وغیرہ۔

کسی امت کا دور زوال میں پہنچنا کیا ہے، وہ ایک عمومی مثال کے مطابق، تاڑ سے گر کر کھجور پر اٹکنا ہے۔ ایسے وقت میں امت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عام قوموں کی طرح صرف ایک مادی قوم بن جاتی ہے۔ تاہم اپنی تاریخی روایات کے مطابق، اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دین سے قطع تعلق کرلے۔ دین اس کے لیے ایک روایتی وراثت ہوتا ہے۔ دین اس کی قومی شناخت ہوتا ہے۔ دین کی تاریخ اس کے لیے فخر کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اس کے

ادارے اور اس کی سرگرمیاں، سب کی سب، دین کے نام پر کھڑی ہوتی ہیں۔ دین اب اس کے لیے صرف دین نہیں رہتا، بلکہ وہ اس کی دنیوی حیثیت کی واحد علامت بن جاتا ہے۔

کسی امت پر جب یہ وقت آتا ہے تو اُس وقت اس کے اندر وہ ظاہرہ فروغ پاتا ہے جس کو مذہبی انتہا پسندی کہا جاتا ہے۔ فطری طور پر اُس وقت اِس مذہبی انتہا پسندی کا اظہار دین کی اسپرٹ میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ظواہر میں ہوتا ہے۔ اُس وقت دین کا اظہار اُن معاملات میں ہوتا ہے جن کا تعلق زندگی کے دنیوی یا مادّی پہلو سے ہو۔

ایک زوال یافتہ امت کے اندر کام کا آغاز افراد کی اصلاح سے ہوتا ہے، نہ کہ اجتماعی اقدام سے۔ ایسی امت کے اندر اگر کوئی اجتماعی ادارہ بنایا جائے، اس کے اندر کوئی حکومت قائم کی جائے، اس کے اندر کوئی تنظیم قائم کی جائے تو ایسا ہر اقدام ہمیشہ نتیجے کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوگا۔ کیوں کہ زوال یافتہ امت کے اندر بنائے ہوئے اجتماعی ادارے کے ارکان بھی زوال یافتہ ہوں گے۔ اِس بنا پر اِس قسم کا اجتماعی ادارہ اپنے در و دیوار یا ظاہری دھوم کے اعتبار سے تو ادارہ نظر آئے گا، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ صرف ایک شان دار قبرستان ہوگا، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔ (الرسالہ، نومبر 2014)

ایک آیت

قرآن میں ہے کہ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں: وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)۔

ان الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ما انزل اللہ" کے مطابق فیصلہ نہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بعض اعمال پر کفر کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْر (صحیح البخاری، حدیث نمبر 47)۔ یعنی، مسلم کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو لے کر کچھ اسلام پسند حضرات ان مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک "ما انزل اللہ" پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت وہ بہت سے مسلم حکمرانوں کو مرتد اور کافر بتاتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ بدترین گمراہی ہے اور اس نے عالم اسلام میں خارجیت جیسے ایک فتنہ کو دوبارہ شدید تر صورت میں زندہ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان مسلمان کو قتل کر رہے ہیں، بلکہ خود اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کی ہوگئی ہے جو تشدد اور خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہو۔

اس قسم کی آیات اور احادیث کی صحیح تفسیر وہ ہے، جو حبر الامت اور امام التفسیر عبد اللہ بن عباس نے کی۔ انہوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس سے آدمی خارج از اسلام قرار پاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد: كُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ (سنن ترمذی، حدیث نمبر 2635) ہے۔ یعنی کفر سے کم تر درجہ کا ایک کفر۔

قرآن وحدیث میں جہاں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فقہی یا قانونی مفہوم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسلوب کلام ہے۔ وہ دراصل زجر میں مبالغہ ہے۔ یہ شدت کلام کی ایک مثال ہے۔ اور ناصحانہ کلام میں ہمیشہ اس قسم کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کبھی ایک قسم کے الفاظ میں اور کبھی دوسرے قسم کے الفاظ میں۔ یہ قانونی زبان اور ناصحانہ زبان کا فرق ہے، نہ کہ فقہی معنوں میں مسلم اور کافر کا فرق۔

نصیحت اور تنبیہ کبھی سادہ الفاظ میں کی جاتی ہے اور کبھی شدید الفاظ میں۔ مذکورہ مثالیں اسی نوعیت کی شدید انداز کی مثالیں ہیں۔ (الرسالہ، ستمبر 1996)

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ الْغَلُوطَاتِ (مسند احمد، حدیث نمبر 23687)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

غلوطات سے منع کیا ہے۔ غلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کیے جاتے ہیں۔ (هِيَ الْمَسَائِلُ الَّتِي لَمْ تَقَعْ)۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَقُولُ: إِنَّ اللَّهَ كَرِهَ لَكُمْ ثَلَاثًا: قِيلَ وَقَالَ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1477)۔ اللہ نے تمہارے لیے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانے سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجیے: ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو؟ اس کی زبان سے نکلا: أَنَا مُؤْمِنٌ إِنْ شَاءَ اللَّهُ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں)۔ یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر بعد کے ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا نا جائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ نا جائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔ شافعی

مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ: أَنَا مُؤْمِنٌ إِنْ شَاءَاللّٰہُ (میں مومن ہوں، اگر اللہ نے چاہا) کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس، حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اپنے ایمان میں شک ہے (لَا يَصِحُّ لِأَنَّهَا تَشُكُّ فِي إِيمَانِهَا)۔ دوسروں کا فتوی یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے کہ نکاح درست ہوگا: يَصِح نِكَاحهَا قِيَاسا على الذِّمِّيَّة (ارشاد النقاد للصنعانی، صفحہ 21)۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔ (الرسالہ، جنوری 1983)

شدت پسندی نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تُشَدِّدُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ، فَإِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4904)۔ یعنی، تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تم پر سختی کی جائے گی۔ کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی۔ پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی، تو انہیں لوگوں کے باقیات ہیں گرجوں میں اور خانقاہوں میں۔

اس حدیث میں تشدد سے مراد محدود طور پر صرف مذہبی تشدد یا انتہا پسندانہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جس معاملہ میں بھی اعتدال کا طریقہ چھوڑ کر شدت کا طریقہ اختیار کیا جائے گا، وہ سب اس حدیث کے حکم میں شامل ہوگا۔

اعتقادی شدت پسندی یہ ہے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کی جانے لگے۔ اسی طرح عبادتی شدت پسندی یہ ہے کہ فروعی مسالک کی بنیاد پر الگ الگ مسجدیں بنائی جائیں اور اس کو امت میں تفریق کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح معاملاتی شدت پسندی یہ ہے کہ رخصت کو کم تر سمجھ کر ہر معاملہ کو عزیمت کا سوال بنا دیا جائے۔

شدت پسند آدمی اپنے آپ میں جیتا ہے۔ وہ صرف اپنی امنگوں کو جانتا ہے۔ اس بنا پر اس کی حیثیت اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو سڑک کو خالی سمجھ کر اس کے اوپر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ ایسا آدمی کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز اعتدال پسندی ہے، نہ کہ شدت پسندی۔ شدت پسندی گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کے خلاف جینے کی کوشش کرنا ہے اور اعتدال پسندی خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ شدت پسندی اپنی ذات کے اعتبار سے تواضع کے خلاف ہے اور دوسروں کے اعتبار سے رعایت انسانی کے خلاف۔ اور یہ دونوں چیزیں بلا شبہ اسلام میں مطلوب نہیں۔

شدت پسندی اللہ کو پسند نہیں۔ جولوگ شدت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ متشدانہ طریقہ ان کی روایات میں شامل ہو کر ان کے دین کا جزء بن جاتا ہے۔ اس طرح ان کی بعد کی نسلیں مجبور ہو جاتی ہیں کہ وہ ان کی پیروی کریں۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار سے کم تر درجہ کی دین داری اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس شدت پسندی کا تعلق محدود طور پر صرف رہبانیت سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ہر دینی شعبہ سے ہے۔ مثلاً قومی اور سیاسی حقوق کی جدو جہد کے لیے دو ممکن طریقے ہیں۔ ایک پُر امن جدو جہد اور دوسری پُر تشدد جد و جہد۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ پر امن اور غیر متشدانہ طریقہ کار کے ذریعہ اپنے مقصد کے حصول کی جدو جہد کی جائے۔ اس کے برعکس، اگر متشدانہ طریقہ کار کا انداز اختیار کیا جائے تو اس کے بیک وقت دو نقصان ہوں گے۔ ایک یہ کہ قوم کو غیر ضروری سختیاں برداشت کرنی پڑیں گی۔ دوسرے یہ کہ جب ایک بار متشدانہ طریقہ کار کی روایت قائم ہو جائے گی تو اس کو جدو جہد کے اعلیٰ معیار کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ تشدانہ طریقہ کار کو بے نتیجہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ اس پر قائم رہیں گے۔ کیوں کہ اس سے ہٹنے کے بعد لوگوں کو محسوس ہوگا کہ انھوں نے خود دین کے مطلوب معیار کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کر لیا۔ انھوں نے اقدام کے بجائے پسپائی کو اپنا طریقہ بنا لیا۔

شدت پسندی ہی کی ایک صورت وہ ہے جس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جاتا ہے۔ انتہاپسندی یہ ہے کہ آدمی حقائق اورامکانات کو نظر انداز کر کے اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ وہ عقل کے بجائے اپنے جذبات کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ وہ دور اندیشی کے بجائے عجلت پسندی کی روش اختیار کرلے۔ وہ تدریج کے بجائے چھلانگ کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا چاہے۔

ایسا آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ شوق کو اپنے آگے رکھ دیتا ہے اور دور اندیشی کو اپنے پیچھے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ہر ایک کی ایک حد ہے خواہ وہ کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ ۔ حد کو نظر انداز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جلتے ہوئے انگارے کی گرمی کا اندازہ کرنے کے لیے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یا پتھر کو توڑنے کے لیے اپنے سر کو ہتھوڑا بنالے۔ اس قسم کا ہر فعل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والے لوگ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے (الرسالہ، فروری 2003)۔

ناقابلِ معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آ گیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔

مذکورہ مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہوگئی اور وہ مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا — قَتَلوهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 336)۔ یعنی، انہوں نے اس کو ہلاک کرڈالا، خدا انہیں ہلاک کرے۔

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارے میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑ نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیادہ نازک ہو، جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہو جائے تو ایسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہیے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اصرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔

اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے، جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارے میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائدِ ملت کسی ایسی اجتہادی رائے پر زور دے جس کا نتیجہ ملت کے لیے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا۔

”غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو“ اس مسئلہ میں مفتی اگر

غلط فتوی دیدے تو اس میں کسی کے لیے جان و مال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اس لیے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔

پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جن کے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں، ان میں مفتی کے لیے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کے لیے بری الذمہ ہو چکا ہو (الرسالہ، ستمبر 1983)۔

بے فائدہ باتیں

مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943ء) کو ایک شخص نے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ فلاں شرعی مسئلہ کی حکمت کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا: حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا کے فعل کی حکمت ہم سے پوچھتے ہو ہم خود تمہارے فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنا احتساب کریں اپنی

ذمہ داریوں پر دھیان دیں۔ البتہ خارجی مسائل میں موشگافیاں نکالنے اور ان کی حکمتیں معلوم کرنے کا انہیں بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ذہن قطعاً غیر اسلامی ہے۔ جن لوگوں کا ذہنی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے وہ کبھی حق کو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

کمانے اور گھر بنانے کا معاملہ ہوتو ہر آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی کمائی اچھی ہو جائے اور اس کا مکان اچھا بن جائے۔ مگر دین اور آخرت کا معاملہ ہوتو ہر آدمی ایسے مسائل پر بحث کرنا پسند کرتا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو۔

ایک بزرگ جنہوں نے ایک بڑے ادارہ میں 30 سال فتوی نویسی میں گزارے تھے، انہوں نے کہا کہ اس پوری مدت میں ہمارے پاس جو استفتا آتے رہے وہ زیادہ تر دوسروں کے بارے میں تھے اپنے بارے میں بہت کم ہم سے کسی نے سوال کیا۔ فلاں کی جائیداد میں میرا کتنا حصہ بنتا ہے۔ فلاں شخص جو ایسا اور ایسا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات تو بہت آتے رہے مگر کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ اس کی اپنی شرعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ اپنے صاحبِ معاملہ کے حقوق کس طرح ادا کرے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ اختلاف اور شکایت کے موقع پر لوگوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔ فلاں شخص جس کو وہ ستا رہا ہے اس کو ستانا اس کے لیے جائز ہے یا ناجائز ہے۔ فلاں آدمی جس کا اس نے پیسہ دبا رکھا

ہے وہ اس کو دبانا چاہیے یا نہیں دبانا چاہیے۔ فلاں شخص جس کو وہ بے عزت کر رہا ہے وہ اس کے لیے درست ہے یا نہیں۔

آدمی دوسروں میں گم رہتا ہے حالانکہ اس کو اپنے آپ میں گم ہونا چاہیے۔ وہ خارجی مسائل میں جیتا ہے حالانکہ اس کو اپنے اندرونی مسائل میں جینا چاہیے۔ وہ دوسروں کے دین وایمان کو ناپتا ہے حالانکہ اس کو وہ پیمانہ حاصل کرنا چاہیے جس میں وہ اپنے دین وایمان کو ناپ سکے — باہر دوڑنے والے بدجانور کی خبر ہر ایک کو ہے مگر اپنے دماغ میں بغض اور انتقام کا جو بدجانور بسیرا لیے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں۔ عبادت گاہ کے باہر کا تماشا ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے مگر عبادت کے اندر ہونے والا تماشا کسی کو نظر نہیں آتا (الرسالہ، مارچ 1981)۔

فتویٰ ایکٹوزم یا ایجوکیشنل ایکٹوزم

آج کل مختلف قسم کے ایکٹوزم (activism) کا چرچا ہے۔ مثلاً پولٹکل ایکٹوزم، سوشل ایکٹوزم، ملّی ایکٹوزم اور میڈیا ایکٹوزم، وغیرہ۔ انہیں میں سے ایک وہ ہے جس کو جوڈیشل ایکٹوزم (judicial activisim) کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پبلک انٹرسٹ (مفاد عامہ) کے کاموں میں عدالت سے رجوع کرکے اس کا حکم حاصل کرنا، قانون کی مدد سے مفاد عامہ سے تعلق رکھنے والے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ جوڈیشل ایکٹوزم کا یہ طریقہ سیکولر طبقے کے لوگوں کے یہاں رائج ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے کچھ مذہبی طبقے نے کچھ عرصے سے وہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے جس کو فتویٰ ایکٹوزم کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی اصلاح کے مقصد کے لیے فتوے کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً کسی لباس کو غیر دینی لباس بتا کر اس کے خلاف فتویٰ دینا، کسی مشروب کو غیر اسلامی مشروب بتا کر اس کی حرمت کا فتویٰ جاری کرنا، کسی مذہبی مقام پر عورتوں کے جانے کو ممنوع قرار دینے کے لیے فتویٰ جاری کرنا، کسی کو پیغمبر ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والا بتا کر اس کے قتل کا فتویٰ صادر کرنا، کسی مصنف کو متنازعہ قرار دے کر یہ فتویٰ جاری کرنا کہ اس کی کتابیں نہ پڑھو، کسی کو مرتد قرار دے کر اس کے خلاف بائیکاٹ کا فتویٰ جاری کرنا، ٹیلی ویژن یا اسی قسم کی اور چیزوں کو حرام قرار دے کر ان سے اجتناب کرنے کا فتویٰ دینا، بینکنگ اور اسی طرح دوسری نئی چیزوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کے عدم استعمال کا فتویٰ دینا، وغیرہ۔

اس قسم کے فتوے موجودہ زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں دیے گئے ہیں مگر سب کے سب بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر فتوے کا صرف یہ انجام ہوا کہ وہ مطلوب نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ پورے جدید دور میں مجھے صرف ایک واقعہ معلوم ہے جب کہ مفتی نے استفتا کے باوجود فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔

یہی طریقہ میرے نزدیک صحیح طریقہ تھا۔ برٹش دور میں دہلی میں ایک عالم تھے۔ ان کا نام مولانا عبدالحق حقانی (وفات 1831) تھا۔ انہوں نے قرآن کی

ایک تفسیر لکھی تھی جو ''تفسیر حقانی'' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے زمانے میں انگریزی حکومت نے سونے چاندی کے سکے کی جگہ کاغذی نوٹ جاری کیے۔ یہ کاغذی نوٹ روایتی فقہی مسئلے کے اعتبار سے بظاہر غیر اسلامی تھے۔ مولانا عبدالحق حقانی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ کاغذی نوٹ کا طریقہ اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا ناجائز۔ انھوں نے اس استفتا پر کوئی فتوی نہیں دیا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ میرا فتویٰ نہیں چلے گا اور نوٹ چل جائے گا۔ اس طرح کے معاملے میں یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

فتویٰ کا لفظی مطلب رائے (opinion) ہے۔ فتویٰ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص خود اپنے بارے میں پوچھے کہ مجھے فلاں معاملہ در پیش ہے۔ میں اس میں کیا کروں۔ مثلاً ایک خاتون کھلاڑی اپنے ڈریس کے بارے میں پوچھے کہ کھیل کے دوران مجھے اسلامی نقطۂ نظر سے کون سا ڈریس استعمال کرنا چاہیے۔ ایسی حالت میں فتویٰ دینا درست ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب کہ فتویٰ پوچھنے والا خود اپنے بارے میں حکم کی پیروی کی نیت سے مفتی سے سوال کرے۔ ایسی حالت میں مفتی کو فتویٰ پوچھنے والے کو جواب دینا چاہیے۔ فتوے کا صحیح استعمال اور اس کا درست محل یہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سماج میں ایک بُرائی موجود ہے۔ اس کے بارے میں خود سماج کی طرف سے کوئی سوال نہ کیا جا رہا ہو۔ ایک شخص ذاتی طور پر اس سماجی مسئلے کو لے کر اس کے متعلق استفتا مرتب کرے اور اس کے

بارے میں مفتی سے فتویٰ پوچھے۔ اس صورت میں اگر مفتی فتویٰ دیتا ہے تو وہ فتوے کا غلط استعمال کرتا ہے۔ ایسا فتویٰ مثبت معنوں میں کوئی اصلاح تو پیدا نہیں کرے گا البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔

مثال کے طور پر کئی سماجی برائیاں ہیں جن کے خلاف مفتی صاحبان نے موجودہ زمانے میں فتوے دیے ہیں۔ مگر مولانا عبدالحق حقانی کی زبان میں یہ ہوا کہ ان کا فتویٰ تو نہیں چلا البتہ برائیاں بدستور جاری رہیں۔ مثلاً بدعات کے خلاف فتویٰ، مشرکانہ رسموں کے خلاف فتویٰ، شادیوں میں جہیز کے خلاف فتویٰ، ٹی وی اور سینما کے خلاف فتویٰ، لاؤڈ اسپیکر کے خلاف فتویٰ، بینک انٹرسٹ کے خلاف فتویٰ، داڑھی نہ رکھنے کے خلاف فتویٰ، مغربی لباس کے خلاف فتویٰ، انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ، وغیرہ۔ جیسا کہ معلوم ہے یہ تمام فتوے بے نتیجہ ہو کر رہ گئے، معاشرے کے اوپر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

میرے مطالعے کے مطابق، اس معاملے میں صحیح بات یہ ہے کہ صرف صاحب معاملہ کو اپنے بارے میں استفتا کا حق ہے اور اسی طرح کے معاملے میں مفتی کو فتویٰ دینا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مفتی کے پاس اس قسم کا استفتا بھیجے کہ فلاں مسجد کے امام کی داڑھی چھوٹی ہے، تو کیا ایسے امام کے پیچھے مقتدیوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں۔ اس قسم کا استفتا ایک فتنہ ہے، نہ کہ حقیقتاً کوئی استفتا۔ مفتی کو چاہیے کہ وہ ایسے استفتا کا جواب نہ دے۔ استفتا کا تعلق، فتویٰ پوچھنے والے کے ذاتی معاملے سے ہے، نہ کہ اس کی ذات کے باہر دوسروں کے معاملے سے۔

اب سوال یہ ہے کہ عمومی اصلاح یا معاشرتی اصلاح کے بارے میں اسلام کا طریقہ کیا ہے۔ یہ طریقہ تذکیر اور نصیحت کا طریقہ ہے، نہ کہ فتوے کا طریقہ۔ یعنی تحریر اور تقریر کے ذریعے لوگوں کو سمجھانا۔ سمجھانے کے یہ کام "قول بلیغ" کی زبان میں ہونا چاہیے ۔یعنی ایسی زبان اور دلیل جو سننے والے کے دل میں اُتر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرلے۔

نصیحت اور تذکیر کے اس طریقے کو آج کل کی زبان میں ایجوکیشنل ایکٹوزم کہا جا سکتا ہے۔یعنی تعلیم اور تربیت کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کرنا، لوگوں کے ذہن کو بدلنے کی کوشش کرنا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اصلاح معاشرہ کے بارے میں اسلام کا اصول ایجوکیشنل ایکٹوزم پر مبنی ہے، نہ کہ فتوی ایکٹوزم پر۔

اس معاملے میں ایک رہنما مثال وہ ہے جس کا ذکر صحیح البخاری میں آیا ہے۔حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں قرآن کی جو آیتیں اُتریں ان میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔تا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں نرم گوشہ پیدا ہو اور لوگوں کے اندر ذہنی آمادگی آجائے ۔اس طرح جب قبولیت کی استعداد پیدا ہوگئی تو اس کے بعد قرآن میں اترا کہ زنا چھوڑ دو اور شراب چھوڑ دو۔ ایسا حکم اگر پہلے اترتا تو لوگ اس کی تعمیل نہ کرتے بلکہ وہ یہ کہتے کہ ہم تو زنا نہ چھوڑیں گے،ہم شراب نہ چھوڑیں گے: إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُورَةٌ مِنَ الْمُفَصَّلِ، فِيهَا ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الْإِسْلَامِ نَزَلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ، وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ: لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ،

لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا، وَلَوْ نَزَلَ: لَا تَزْنُوا، لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمومی اصلاح کا کام فتویٰ یا حکم جاری کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کام کے لیے سب سے پہلے لوگوں کے اندر قبولیت کی استعداد پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ استعداد پیدا کیے بغیر حکم دینا کسی بھی درجے میں مسئلے کا کوئی حل نہیں۔

جب بھی کسی معاشرے میں بگاڑ آتا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو حکم یا قانون کا علم نہیں ہے۔ اس لیے لاعلمی کی بنا پر لوگ غلط کاموں میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرتی بگاڑ کا سبب لوگوں کے اندر اسپرٹ کی کمی ہوتی ہے، نہ یہ کہ وہ حکم اور قانون سے بے خبر ہیں۔

ایسی حالت میں سماجی سدھار یا معاشرے کی اصلاح کا نقطۂ آغاز یہ نہیں کہ قانونی حکم کو لے کر فتویٰ صادر کیا جائے بلکہ اس کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اسپرٹ کو جگایا جائے، لوگوں کے اندر شعور کو زندہ کیا جائے، لوگوں کے اندر قبولیت کا مادّہ پیدا کیا جائے۔ جب یہ کام قابل لحاظ حد تک ہو جائے اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ لوگوں کو حکم اور قانون کی زبان میں مسائل سے آگاہ کیا جائے۔ داخلی استعداد پیدا کرنے سے پہلے، خارجی احکام کا اعلان کرنا ایک غلط ترتیب ہے۔ یہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے، جو کہ یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔

فتویٰ ایکٹوزم ہو یا دوسرا کوئی ایکٹوزم ہر ایک کو جانچنے کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ کسی عمل کی درستگی کو جاننے کا ذریعہ صرف اس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ عمل کو ہمیشہ نتیجہ رخی عمل (result-oriented action) ہونا چاہیے، اور فتوی ایکٹوزم بلاشبہ اس اصول عام سے مستثنیٰ نہیں۔ (الرسالہ، ستمبر 2006)

فتویٰ کا غلط استعمال

ریاست جموں اور کشمیر میں اکثر فوج اور تشدد پسندوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر تشدد پسند لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عمارتوں میں داخل ہو کر وہاں پناہ لے لیتے ہیں اور وہاں سے اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں اور فطری طور پر مذہبی عمارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ صورت حال وادی کے مدرسے اور مسجد اور درگاہ وغیرہ میں عرصے سے جاری ہے۔

ہندوستانی فوج نے اس صورت حال کے پیش نظر عرصے سے کشمیر میں "سد بھاؤنا آپریشن" کے نام سے ایک مہم چلا رکھی ہے۔ اُن کے پاس گورنمنٹ آف انڈیا کا فنڈ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کی مدد سے مسجد اور مدرسہ اور خانقاہ کی عمارتوں میں ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتے ہیں اور اُس کو پھر سے درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام کشمیر میں کئی سالوں سے جاری ہے۔

جون 2007 میں سری نگر کے علاقہ راجوری کدل میں علما کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں کشمیری مسلمانوں کے مذہبی رہنما 350 کی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں انھوں نے فتویٰ یا بیان کی صورت متفقہ طور پر ایک ریزولوشن پاس کیا۔اس میں کہا گیا تھا کہ مسجد کی مرمت غیر مسلموں کے ہاتھ سے کرنا اسلام میں حرام ہے۔اس لیے ''سدبھاؤنا آپریشن'' کا یہ کام دین میں مداخلت کی حیثیت رکھتا ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کو چاہیے کہ وہ اس کام کو فوراً بند کرے۔

یہ فتویٰ یا بیان سراسر بے بنیاد ہے۔ یہ اسلام کو اپنے سیاسی مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے، اُس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں، اور خود ہندستان میں ایسا برابر ہوتا رہا ہے کہ غیر مسلم لوگوں کے تعاون سے مسجدیں بنائی گئی ہیں یا اُن کی مرمت کا کام ہوا ہے مگر علما نے کبھی اس کام کو غلط نہیں بتایا۔

اس معاملے میں سب سے بڑی مثال خود کعبہ کی ہے جو گویا کہ تمام مسجدوں کا نمائندہ ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کعبہ یا بیت اللہ کو مکہ میں چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں ہوئی۔ اُس وقت وہاں کعبہ کی جو سنگی عمارت تھی وہ ابراہیمی تعمیر کے مطابق تھی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کعبہ کی ابراہیمی عمارت بارش کی وجہ سے ڈھ گئی تھی۔ اُس وقت مکہ کے لوگوں نے کعبہ

کی دوبارہ تعمیر کی۔ مکہ کے یہ لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت مکہ میں خانہ کعبہ کی جو عمارت تھی وہ مشرکین کے ہاتھوں بنائی گئی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا، یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ فتح ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں کا اختیار حاصل ہو گیا تب بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ مشرکین کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھائیں اور دوبارہ اس کو اہل ایمان کے ذریعے تعمیر کرائیں۔

تاریخ مزید بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے وقت کعبہ کے اوپر جو غلاف تھا وہ مشرکین کا بنایا ہوا تھا۔ اُس کو بنانے میں بت پرستوں کا مال استعمال ہوا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر فتح حاصل کرنے کے باوجود اس قدیم غلاف کو نہیں بدلا۔ بعد کو ایسا ہوا کہ ایک عورت کی غلطی سے یہ غلاف جل گیا۔ اس کے بعد آپ نے نیا غلاف تیار کر کے اس کے اوپر ڈالا۔ گویا کہ غلاف کی تبدیلی صرف اُس وقت کی گئی جب کہ یہ تبدیلی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔

تاریخ میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ مسجد یا مدرسے میں غیر مسلم کا تعاون لینا عین جائز ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ ایسے فعل کو دین میں مداخلت کہنا سراسر غلط ہے، بلکہ یہ فتنہ انگیزی ہے۔ کیوں کہ اس سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات غیر ضروری طور پر بگڑ سکتے ہیں۔

کسی مسجد یا مدرسے کی بلڈنگ بذات خود مسجد یا مدرسہ نہیں ہے وہ صرف مسجد یا مدرسے کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ مسجد اصلاً عبادت کا مقام ہے۔ اسی طرح مدرسہ اصلاً تعلیم کا مقام ہے۔ ظاہری ڈھانچے کے بارے میں اس قسم کے فتوے یا بیانات اسلام کی روح کو سخت نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اس سے غیر ضروری طور پر ساری اہمیت ڈھانچے کی بن جاتی ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ عبادت اور تعلیم کو اہمیت دی جائے ۔ سارا زور اور تاکید بہتر عبادت اور بہتر تعلیم پر ہو۔ ڈھانچے کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرنا لوگوں کے ذہن کو بگاڑنا ہے۔ اور ذہن کو بگاڑنا اسلام میں ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس قسم کا منفی ذہن مسلمانوں کے اندر کیوں پیدا ہوا۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں دعوت کا مزاج کھو دیا۔ دوسری اقوام ان کے لیے مدعو نہ رہیں، بلکہ وہ ان کی حریف اور رقیب بن گئیں۔ اس منفی مزاج کا نتیجہ ہے جو کہ مذکورہ قسم کی نامحمود چیزوں کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔

مسلمان کا صحیح مسلم مزاج وہ ہے جس کو دعوتی مزاج کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا جو موجودہ مزاج ہے، وہ قومی مزاج ہے، نہ کہ دعوتی مزاج۔ دعوت دوسرے انسانوں تک خدا کا ابدی پیغام رحمت پہنچانے کا نام ہے۔ اس قسم کا مشن اپنے آپ داعی کو دوسرے انسانوں کا ہمدرد اور خیر خواہ بنا

دیتا ہے۔ یہ مشن آدمی کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ مشن آدمی کو دوسرے انسانوں کے حق میں نرم اور شفیق بنا دیتا ہے۔قومی مزاج کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

قومی مزاج آدمی کے اندر دوسروں کے خلاف رقیبانہ مزاج پیدا کر دیتا ہے۔قومی مزاج ہمیشہ مادی مفادات کی بنیاد پر بنتا ہے۔اس قسم کے مزاج میں دوسروں کے لیے شکایات ہوتی ہیں، نہ کہ ہمدردی اور خیر خواہی۔آج کل مسلمانوں کا عام طور پر یہی قومی مزاج بن گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں منفی نفسیات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ منفی مزاج اُن کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے (الرسالہ، اکتوبر 2007)۔

کلچرل ہیرٹیج کا پریزرویشن

کلچرل ہیرٹیج (cultural heritage) اسی چیز کا دوسرا نام ہے جس کو عام طور پر ہسٹاریکل مانیومنٹ (historical monument) کہا جاتا ہے۔مقامی ریفرنس کے اعتبار سے وہ کلچرل ہیرٹیج ہے اور یونیورسل ریفرنس کے اعتبار سے وہ ہسٹاریکل مانیومنٹ۔کلچرل ہیرٹیج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کی اہمیت اسلامی ٹریڈیشن میں بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مانی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچرل ہیرٹیج کا پریزرویشن (preservation) انسانیت کے ان عمومی معاملات میں سے ہے جس میں سیکولر پوائنٹ آف ویو اور اسلامک پوائنٹ آف ویو کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسلام کے مطابق بھی وہ بلا شبہ اس قابل ہے کہ اس کو محفوظ (preserve) کیا جائے۔ ماضی کے ریکارڈ کو اگر محفوظ نہ رکھا جائے تو مستقبل کی نسلوں کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسا تاریخی نقصان ہے جس کی تلافی کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

اسلام فطرت کا دین ہے۔ ہر وہ چیز جو فطرت اور ریزن کے مطابق قابل لحاظ ہو وہ یقیناً اسلام میں بھی قابل لحاظ قرار پائے گی۔ کسی چیز کا فطری تقاضا ہونا بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلام کا تقاضا بھی ہے۔

اسلامی شریعت میں ایک اہم اور مسلّمہ اصول یہ ہے کہ: الْأَصْلُ فِي الْأَشْيَاءِ الْإِبَاحَةُ (المبسوط للسرخسی، جلد 24، صفحہ 77)۔ یعنی، چیزوں میں اصل ان کا مباح ہونا ہے۔ اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھیے تو کلچرل ہرٹیج کو پریزرو کرنا یقینی طور پر اسلام میں ایک جائز کام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سنت میں کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ کلچرل ہیرٹیج کو پریزرو نہ کرو۔ اور جب قرآن اور سنت میں اس قسم کی کوئی ممانعت موجود نہیں تو کلچرل ہیرٹیج کو پریزرو کرنا اپنے آپ جائز قرار پائے گا۔ اس عمل کو جائز

ٹھہرانے کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ تاہم قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلچرل ہیریٹج کی اہمیت کے بارے میں ایسے حوالے بھی موجود ہیں جو اس کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے براہ راست ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں اسلامی ماخذ سے چند متعلق حوالے درج کیے جاتے ہیں۔

ا۔ قرآن میں اس سلسلے کی ایک آیت یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ (46:4)۔ یعنی، تم میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو۔ قرآن کی اس آیت میں اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ (کوئی علم جو چلا آتا ہو) کا مطلب remnant of knowledge ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں آرکیالوجیکل ریکارڈ یا ہسٹاریکل ریکارڈ کہا جاتا ہے۔

اس قسم کا ریکارڈ ماضی کے واقعات کو جاننے کے لیے نہایت اہم علمی ذریعہ ہے۔ ایسی حالت میں ماضی کے اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے علمی نقطۂ نظر سے بھی اور اسلامی نقطۂ نظر سے بھی۔

2۔ کلچرل ریکارڈ یا ہسٹاریکل کو محفوظ رکھنے کی ایک عملی مثال قرآن میں وہ ہے جو فرعون کے تذکرہ کے ذیل میں آئی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موسیٰ کا ہم عصر فرعون جب غرق ہو کر مرا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ —

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (10:92)۔یعنی، آج ہم تمہارے بدن کو محفوظ رکھیں گے تا کہ وہ تمہارے بعد والوں کے لیے نشانی ہو۔

جیسا کہ معلوم ہے مذکورہ فرعون کا جسم مصری رواج کے مطابق، مرنے کے بعد مومیائی کر کے ایک اہرام میں رکھ دیا گیا تھا۔ یہ بلا شبہ قدیم مصری کلچر کا ایک حصہ تھا۔ مصری کلچر کا یہ حصہ خود خدا کے منصوبے کے تحت محفوظ رہا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں اس کو مصر کے ایک اہرام سے نکالا گیا۔ اور کاربن ڈیٹنگ کے جدید طریقہ کو اپلائی کر کے یہ معلوم ہوا کہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں غرق ہوا تھا۔ فرعون کا یہ محفوظ جسم قاہرہ کے میوزیم میں قرآن کی مذکورہ آیت کی ایک شہادت کے طور پر آج بھی رکھا ہوا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے فرعون ایک مشرک بادشاہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی مرضی یہ ہوئی کہ اس کے جسم کو محفوظ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلچرل ہسٹری کی نہ صرف عام چیزیں بلکہ مشرک بادشاہ کا جسم بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ بامیان میں واقع بودھ کے دو ہزار سالہ مجسموں کو محفوظ رکھنا اسلام میں بھی اُسی طرح مطلوب ہے جس طرح دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مطلوب ہے یا ہو سکتا ہے۔

3۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ ان کے

یہاں ایک وراثتی تابوت (صندوق) موجود تھا جو نسل در نسل ان کے یہاں ذریعہ سکون کے طور پر محفوظ رہا۔ اس تابوت میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے تبرکات محفوظ کیے گئے تھے۔ گویا یہ عین وہی چیز تھی جس کو موجودہ زمانے میں کلچرل ہیریٹج کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وراثتی تابوت کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ ایک موقع پر اس کو فرشتے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے۔ (2:248)

میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہیریٹج کو محفوظ کرنے کی یہ ایک براہ راست مثال قرآن میں موجود ہے۔ اس سے کلچرل ہیریٹج کی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ایسی چیز کو نسل در نسل محفوظ رکھنا شریعت الٰہی کے خلاف نہیں۔

4۔ قرآن میں مومن کی ایک صفت "السائح" بتائی گئی ہے (9:112)۔ یعنی سیاحت کر کے زمین کے مختلف مقامات پر جانا اور پچھلی قوموں کے چھوڑے ہوئے آثار و مساکن کو دیکھ کر ان سے نصیحت لینا (28:58)۔ قرآن میں تکرار کے ساتھ یہ آیت آئی ہے: قُلْ سِیْرُوا فِی الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (6:11)۔ یعنی، کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

اس کے مطابق، اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ماضی کے تاریخی آثار کو اس کی ابتدائی شکل میں محفوظ رکھا جائے تا کہ دیکھنے والے لوگ ان سے سبق

لے سکیں۔ تاریخی آثار کو محفوظ نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کا یہ سیاحتی مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

5۔ کلچر ہمیشہ ایک طبقہ یا ایک کمیونٹی کی وراثت ہوتا ہے۔ ہر کمیونٹی کو یہ مطلق رائٹ حاصل ہے کہ وہ اپنے کلچر کا تحفظ کرے۔ کلچر کے معاملے میں نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ اسلام کے موافق ہے یا اس کے خلاف۔ جب بھی کوئی کمیونٹی کسی کلچر کو اپنا کلچر سمجھے اور اس کو محفوظ رکھنا چاہے تو یہ حق اس کو دیا جائے گا۔ یہ حق جس طرح سیکولرزم میں تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح وہ اسلام میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کے خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں یروشلم (ایلیا) فتح ہوا تو خود عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ سے سفر کرکے یروشلم گئے۔ اس وقت اسلامی خلافت اور مسیحی فرقہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا کہ مسیحی چرچوں میں جو چیزیں ہیں وہ محفوظ رہیں گی۔ مثلاً مریم اور مسیح کے بت، وہ مقدس لکڑی جس پر مسیحی عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کو سولی دی گئی، وغیرہ۔

هٰذَا مَا أَعْطَى عَبْدُ اللّٰهِ عُمَرُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ أَهْلَ إِيلِيَاءَ مِنَ الْأَمَانِ، أَعْطَاهُمْ أَمَانًا لِأَنْفُسِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ، وَلِكَنَائِسِهِمْ وَصُلْبَانِهِمْ، وَسَقِيمِهَا وَبَرِيئِهَا وَسَائِرِ مِلَّتِهَا، أَنَّهُ لَا تُسْكَنُ

كَنَائِسُهُمْ وَلَا تُهْدَمُ، وَلَا يُنْتَقَصُ مِنْهَا وَلَا مِنْ حَيْزِهَا، وَلَا مِنْ صَلِيبِهِمْ، وَلَا مِنْ شَيْءٍ مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَلَا يُكْرَهُونَ عَلَى دِينِهِمْ، وَلَا يُضَارُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ (**تاریخ الطبری ، جلد 3، صفحہ 609**)۔

اس قسم کی چیزیں مسیحی کلچر کا حصہ تھیں مگر معاہدہ میں یہ لکھا گیا کہ مسیحی فرقہ کو یہ حق ہوگا کہ ان کے چرچ ڈھائے نہ جائیں اور ان کے کلچرل ہریٹج کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنے کلچر کی حفاظت کریں۔

خلیفہ ثانی کے اس عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے کلچر کا حصہ سمجھتی ہے اس کو وہ محفوظ رکھے خواہ وہ مسلم حکومت کے اندر ہو یا مسلم حکومت کے باہر۔ کسی حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی گروہ کے کلچر کے معاملے میں دخل دے۔ کلچر کے تحفظ کا معاملہ حکومتی مداخلت سے آزاد معاملہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ بین الاقوامی اہمیت کی چیزوں میں اسلام کا نارم (norm) بھی وہی ہوگا، جو دوسری قوموں کا متفقہ نارم ہو۔ انٹرنیشنل نارم کے معاملے میں اسلام کا یہ اصول پیغمبر اسلام ﷺ کے بعض واقعات سے مستنبط ہوتا ہے۔

مثلاً رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے میں یمن کے ایک شخص مسیلمہ

نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ بھیجا اور یہ کہلوایا کہ آپ میری نبوت کو قبول کریں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان دو آدمیوں سے پوچھا کہ مسیلمہ کے معاملے میں تمہاری اپنی رائے کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ہم بھی اس کو اس دعویٰ کے مطابق نبی مانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ رواج نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں ضرور تم دونوں کو قتل کر دیتا (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2761)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز انٹرنیشنل طور پر تسلیم کر لی جائے تو اسلام میں بھی اس کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس اصول کی روشنی میں کلچرل ہیریٹج کو محفوظ کرنا اسلام میں بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دوسری قوموں کے نزدیک اہم ہے۔ جدید دنیا میں کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کو نہایت اہمیت کے ساتھ محفوظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی بلا شبہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ اس معاملے میں دوسروں سے الگ اسلام کا کوئی طریقہ نہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کھجور کے درخت نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ یہاں کھجوروں کے باغ ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ ٹاؤن سے باہر ایک باغ کے پاس سے گزرے۔ یہاں کچھ لوگ کھجور کے درخت پر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے ہینڈ پالی نیشن

(hand pollination) کا کام کر رہے تھے۔ آپ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

اگلے سال کھجور کی فصل کم آئی۔ آپ نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ آپ نے پالی نیشن (تأبیر نخل) سے منع کر دیا تھا جب کہ اسی سے کھجوریں اچھی فصل آتی ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ تم جو کرتے تھے اس کو کرو کیونکہ تم اپنی دنیا کے معاملے میں زیادہ جانتے ہو— أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2362)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے عقیدہ اور امورِ دنیا کا فرق۔ اسلام کے مطابق زندگی کے وہ معاملات جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے امورِ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ان کو عقیدہ کے تابع نہیں رکھا جائے گا، بلکہ ایسے موضوعات علمی ریسرچ کے تابع ہوں گے۔ ان میں وہی چیز درست قرار پائے گی جو علمی ریسرچ سے درست قرار پاتی ہو۔ ایگری کلچر اور ہارٹی کلچر سے لے کر انجینئر نگ اور ہسٹری کے شعبے تک سب اس میں شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کے پریز رویشن کا معاملہ بھی انہیں چیزوں میں سے ہے جو علمی ریسرچ کے تابع ہیں، نہ کہ عقیدہ (faith) کے تابع۔

خلاصہ یہ کہ اصولی ہدایات اور عملی نظائر دونوں اعتبار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کے پریزرویشن کے معاملے میں اسلام کی رائے بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن کی ہے۔ بالفرض اگر کسی مسلم ملک میں کوئی مانیومنٹ ایسا ہو جس کو کسی بنا پر ملک کے اندر رکھنا مناسب نہ ہو تو ایسی حالت میں اس کو تباہ نہیں کیا جائے گا بلکہ خواہش مند قوموں اور ملکوں کو اسے ایکسپورٹ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اس کو اپنے میوزیم میں محفوظ کرسکیں۔

افغانستان (بامیان) میں 2001ء گوتم بدھ کے مجسموں کو جس طرح توڑا گیا وہ ہرگز اسلام نہ تھا، وہ غلو (extremism) تھا اور قرآن اور حدیث کے مطابق غلو اسلام میں نہیں۔ (الرسالہ، اپریل 2007)

کفر اور کافر کا مسئلہ

بیسویں صدی میں کمیونسٹ نظریہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا۔ اس کے تحت انسانی سماج کو دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک محنت کش طبقہ (working class) اور دوسرا بورژوا طبقہ۔

بورژوا (bourgeois) ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ یہ لفظ اپنے ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے متوسط طبقہ کے لیے بولا جاتا تھا۔ مگر مارکسی فلسفہ کے زیر اثر وہ ایک تحقیری (derogatory) لفظ بن گیا۔ اس نظریہ کے تحت سماج دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک محنت کش طبقہ جو ہر اعتبار سے معصوم طبقہ کی

حیثیت رکھتا تھا اور دوسرا بورژوا طبقہ جو مارکسی تصور کے مطابق سرمایہ دار طبقہ (capitalist class) کے ہم معنی تھا اور جو مارکس کے مطابق، ہر قسم کی سماجی اور اقتصادی برائی کی جڑ تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ کافر کے لفظ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ کافر کا لفظ ابتدائی طور پر صرف ایک سادہ مفہوم رکھتا تھا۔ لغوی اعتبار سے کافر کے معنی ہیں انکار کرنے والا۔ مگر بعد کے زمانہ میں کافر کا لفظ ایک تحقیری لفظ (derogatory word) بن گیا۔ موجودہ زمانہ میں نظری اعتبار سے یہ غالباً مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سب سے بڑا نزاعی مسئلہ ہے جس سے موجودہ زمانہ کے مسلمان دوچار ہیں۔ ایک مثال سے اس معاملہ کی وضاحت ہوگی۔ اقبال کا خاندان پہلے ایک برہمن خاندان تھا۔ بعد کو وہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

مرا بنگر کہ در ہندستان دیگر نمے بینی　　　برہمن زادہ رمز آشنائے روم وتبریز است

اس شعر میں برہمن زادہ کا لفظ سننے والوں کو بُرا نہیں لگتا۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے برہمن زادہ اور کافر زادہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ لیکن اگر اقبال کے اس شعر کو بدل کر اس طرح کہا جائے:

کافر زادہ، رمز آشنائے روم وتبریز است

اگر شعر میں تبدیلی لائی جائے تو تمام اقبال پسند لوگ غصہ ہو جائیں گے۔

کیونکہ برہمن ایک سادہ لفظ ہے، جب کہ کافر استعمال کے اعتبار سے ایک تحقیری لفظ بن گیا ہے۔

کمیونسٹ اور بورژوا کی تقسیم نے بیسویں صدی میں غیر کمیونسٹ دنیا کو کمیونسٹ لوگوں سے متنفر کر دیا تھا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے مومن اور کافر کی تقسیم نے غیر مسلم دنیا کو مسلمانوں سے بیزار کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ اب اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسے لوگ یہ مانگ کرنے لگے ہیں کہ اسلام پر نظر ثانی کرو اور کافر کے لفظ کو اسلام کی لغت سے خارج کرو۔ جب تک اسلام میں ریفارم نہ لائی جائے مسلم اور غیر مسلم معتدل طور پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسے انتہا پسند لوگوں کا نہیں ہے، بلکہ اب وہ خود مسلمانوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ آج کے صنعتی سماج میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں تعلیم یافتہ مسلمان عام طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ کافر کے رواجی تصور کے ساتھ مشترک سماج میں معتدل طور پر نہیں رہ سکتے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اسلام نے موجودہ زمانہ میں اپنا ریلیونس (relevance) کھو دیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے اسلام کو لے کر وہ آج کے سماج میں عزت کے ساتھ کس طرح رہیں۔

دہلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ ان سے اکثر میری ملاقات

ہوتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری پیدائش اگرچہ مسلمان کے گھر میں ہوئی مگر اب اسلام پر میرا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا مذہب ڈیموکریسی (جمہوریت) ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام انسانیت کو مومن اور کافر کے دونا مساوی طبقوں میں بانٹتا ہے۔ جب کہ ڈیموکریسی سارے انسانوں کو برابر کا درجہ دیتی ہے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میرے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوگا تو میں اس کے کان میں اذان نہیں دلواؤں گا بلکہ کسی پروفیسر کو بلاؤں گا جو بچہ کے کان میں کہے گا ڈیموکریسی، ڈیموکریسی ڈیموکریسی۔

حقیقت یہ ہے کہ کافر کا مسئلہ صرف غیر مسلم لوگوں کا مسئلہ نہیں۔ اب جدید سماج میں وہ بڑے پیمانہ پر خود مسلمانوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور اس کے صحیح مفہوم کو سامنے لایا جائے تا کہ اسلام لوگوں کو وقت کا مذہب معلوم ہو اور مسلم اور غیر مسلم دونوں جدید سماج میں معتدل طور پر دوسروں کے ساتھ رہ سکیں۔ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارا معاملہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ رواجی تصور میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کافر اور غیر مسلم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ جو لوگ مسلمان نہیں وہ سب کے سب کافر ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک غلط تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کافر کا لفظ غیر مسلم کے مترادف نہیں:

The word Kafir is not synonymous with non-Muslim.

داعی اور مدعو کا رشتہ

شریعت کے اعتبار سے مسلمان کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلم کی حیثیت مدعو کی۔ یہ رشتہ لازم کرتا ہے کہ داعی اپنے مدعو کے ساتھ ہمیشہ معتدل تعلق قائم رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ تاجر کو ہمیشہ کسٹمر فرینڈلی (customer friendly) ہونا چاہیے۔ اسی طرح داعی کا فارمولا یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہمیشہ مدعو فرینڈلی ہو۔

Be always *Mad'u* friendly.

مدعو کے حق میں داعی کے اندر خیر خواہانہ جذبات ہونے چاہئیں۔ اگر داعی کے اندر مدعو کے لیے یہ مطلوب جذبات موجود ہوں تو وہ ہرگز اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ ایسے الفاظ بولے جس سے مدعو کے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر وہ سچا داعی ہے تو اپنے دل میں بھی وہ ایسی بات نہیں سوچے گا۔ دعوت کا جذبہ نفرت کا قاتل ہے۔ داعی کا دل ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ ایسے دل کے اندر محبت اور خیر خواہی کے سوا کوئی اور چیز پرورش نہیں پاسکتی۔

قدیم زمانہ میں آرین لوگ جب انڈیا میں آئے تو یہاں کے مقامی لوگوں کو انہوں نے ملیچھ کہا۔ اسی طرح مسیحی علما نے مسلمانوں کو اپنی کتابوں میں انفڈل (infidels) لکھا۔ ملیچھ اور انفڈل دونوں تحقیری الفاظ (derogatory

words) ہیں۔ کہنے والا ان الفاظ کو بول کر خوش ہوتا ہے مگر جس کے بارے میں یہ لفظ بولا گیا ہے وہ اس کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں کوئی تحقیری مفہوم (derogatory sense) نہ ہو، بلکہ وہ سادہ طور پر صرف اظہار واقعہ کے ہم معنی ہو۔ بدقسمتی سے اس معاملہ میں مسلم علما احتیاط کا پہلو اختیار نہ کر سکے۔ وہ اپنی کتابوں میں اور قرآن کے ترجموں میں کافر کے لیے بے تکلف انفڈل کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں: قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

Say thou: O ye infidels(!109:1)

دراصل مسلم علما اور رہنماؤں کی اسی قسم کی غیر احتیاطی باتیں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان سخت تناؤ پیدا ہو گیا ہے جس کا نتیجہ مختلف ناخوشگوار صورتوں میں سامنے آتا رہتا ہے۔

یہی غلطی قرآن کے اردو اور فارسی مترجمین نے بھی کی ہے۔ قرآن کے بہت سے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ مگر غالباً صرف ایک مترجم (شاہ عبدالقادر) کو چھوڑ کر تمام مترجمین نے اس معاملہ میں بے احتیاطی کا انداز اختیار کیا ہے۔ "قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ" کے کچھ ترجمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

بگوا ے کافراں (شاہ ولی اللہ)

کہہ اے کافرو (شاہ رفیع الدین)

آپ ان کافروں سے کہہ دیجیے (اشرف علی تھانوی)

کہہ دو کہ اے کافرو (ابوالاعلیٰ مودودی)

کہہ دو، اے کافرو (امین احسن اصلاحی)

تو کہہ، اے منکرو (شاہ عبدالقادر)

اس قرآنی آیت کے تحت اکثر مترجمین نے اسی قسم کے ترجمے کیے ہیں۔

اس آیت میں کافر کا ترجمہ درست نہیں۔ بالفرض وہ خالص لغوی اعتبار سے غلط نہ ہو تب بھی وہ دوسری قوموں کے لیے ایک قابل اعتراض لفظ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ترجمہ سے احتراز کیا جائے۔ پھر یہ صرف ترجمہ کی بات نہیں اسی ترجمہ کی بنیاد پر ذہن بنتا ہے اور تقریر وتحریر میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ پوری ملت کی منفی ذہن سازی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ہم اور وہ (we and they) کا ذہن پیدا کرتا ہے اور اس قسم کا تقسیمی ذہن دعوتی اعتبار سے درست نہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ غالباً ایک ہی عالم ہیں جنہوں نے قرآن کے ان الفاظ کا درست ترجمہ کیا ہے اور وہ شاہ عبدالقادر دہلوی ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ تمام علما کے نزدیک نہات مستند مانا گیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ آیات کا ترجمہ منکر کیا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر 109 میں: قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ (کہو کہ اے منکرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ طرز خطاب پورے قرآن میں صرف ایک بار اسی ایک سورہ میں استعمال ہوا ہے۔ کافر یا کفار یا کافرون کے الفاظ تو قرآن میں متعدد بار آئے ہیں۔ مگر أَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ جیسے متعین خطاب کی صورت میں اس کا استعمال قرآن میں کسی اور مقام پر نہیں ہوا ہے۔

مفسرین کی رائے کے مطابق، یہاں الکافرون میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی وہ ایک گروہ خاص کے لیے مشخص (specific) طور پر آیا ہے، نہ کہ عمومی طور پر ہر اس شخص کے لیے جو مسلم گروہ سے باہر ہو۔ ذیل میں کچھ مفسرین کے اقوال درج کیے جاتے ہیں:

الْمُخَاطَبُونَ كُفَّارٌ مَخْصُوصُونَ قَدْ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (تفسیر النسفی، جلد 3، صفحہ 687)۔ یعنی، اس کے مخاطب مخصوص منکرین ہیں، جن کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

وَعَنَى بِالْكَافِرِينَ قَوْمًا مُعَيَّنِينَ لَا جَمِيعَ الْكَافِرِينَ (تفسیر القرطبی، جلد 20، صفحہ 226)۔ یعنی، اس سے مراد منکرین کا متعین گروہ ہے، نہ کہ تمام منکرین۔

خِطَابٌ لِجَمَاعَةٍ مَخْصُوصَةٍ (تفسیر المظہری، جلد 10، صفحہ 354)۔ یعنی، یہ خطاب ایک مخصوص جماعت سے ہے۔

قُل يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ ایک مخصوص خطاب ہے اس کو عمومی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی قُل يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ سے مراد ہمیشہ کے لیے صرف قدیم منکرین قریش رہیں گے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے معاصر تھے اور پیغمبرانہ اتمام حجت کے باوجود جنہوں نے پیغمبر کی بات کو ماننے سے انکار کیا۔ زمانہ نبوت کے بعد کے لوگوں کو أَيُّهَا الإِنسَانُ (اے انسانو) کے لفظ سے خطاب کیا جائے گا، نہ کہ أَيُّهَا الْكَافِرُونَ (اے منکرو) کے لفظ سے۔ اب یہی انداز خطاب ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

کافر کا مفہوم

عربی زبان میں کفر کے معنی انکار کے ہیں اور کافر کا مطلب ہے انکار کرنے والا۔ اسلام کے مطابق کافر ایک کردار ہے، کافر کسی قوم کا اجتماعی لقب نہیں:

Kafir is an individual character rather than a group title of a certain race or community.

کافر وہ ہے جو منکر ہو (one who refuses to accept)۔ قرآن کے اردو ترجموں میں سب سے زیادہ صحیح ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافر کا ترجمہ منکر کے لفظ سے کیا ہے۔ یہی اس لفظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ قرآن کے انگریزی مترجمین اکثر کافر کا ترجمہ ان

بلیور (unbeliever) کے لفظ سے کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ ان بلیور کا مطلب غیر مومن یا غیر معتقد ہوتا ہے۔ جب کہ کافر کا مطلب صرف غیر معتقد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اتمام حجت کے باوجود ماننے سے انکار کرے۔

دور اوّل میں جب قرآن کی ابتدائی آیتیں اتریں تو ان میں پیغمبر کے مخاطبین کو کافر نہیں کہا گیا بلکہ ان کے لیے انسان جیسے الفاظ استعمال ہوئے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ: یَاأَیُّھَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَیْكَ مِن رَّبِّكَ ... وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (5:67)۔ یعنی، اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے تم اس کو پہنچا دو ... اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

اس آیت میں دیکھیے۔ یہاں یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (خدا تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہاں یَعْصِمُكَ من الکفار (اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا) کا لفظ استعمال کیا جائے۔ قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہر گروہ کے لیے اصلاً انسان جیسا عمومی لفظ استعمال کیا جائے گا۔ کافر کا لفظ صرف ان افراد تک مخصوص رہے گا جن کے لیے خدا نے خود کافر کا لفظ استعمال کیا ہو۔ کافر کا لفظ ایک خدائی اعلان ہے، وہ انسان کا دیا ہوا خطاب نہیں۔

فعل اور فاعل کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر 109 کی پہلی آیت یہ ہے: قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ (109:1)۔اس آیت میں الکافرون سے مراد قدیم مکہ کے منکرین قریش ہیں۔ ان الفاظ میں قریش کے منکرین کے بارے میں اتمام حجت کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کی نظر میں کافر ہو چکے ہو۔قرآن میں اس طرح تعین اور تشخص کی زبان میں کسی اور گروہ کے کافر ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا۔

قرآن میں دوسرے مقامات پر کفر اور کافر کے الفاظ آئے ہیں ۔مثلاً فرمایا: فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ (64:2)۔یعنی، پھر تم میں سے کوئی منکر ہے اور کوئی مومن۔اسی طرح ارشاد ہوا ہے: فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ کَفَرَ (2:253)۔یعنی، پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا۔ ان دوسری قسم کی آیتوں میں فعل کا ذکر ہے، مگر مشخص طور پر فاعل کا ذکر نہیں۔یعنی یہ تو کہا گیا ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے یا فلاں فعل کا ارتکاب کرنے والا خدا کی نظر میں کافر بن جاتا ہے۔مگر ان دوسری قسم کی آیتوں میں ایسا نہیں کیا گیا ہے کہ کسی گروہ کو مشخص اور متعین کر کے اُس کے بارے میں یہ اعلان کیا جائے کہ فلاں فلاں گروہ کافر ہیں۔

قرآنی بیان میں اس فرق سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔اور وہ اصول یہ ہے کہ یہ کہنے کا حق ہر داعی کو ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے۔مگر یہ حق کسی بھی داعی یا عالم کو نہیں کہ وہ مشخص طور پر یہ اعلان کرے کہ فلاں گروہ یا فلاں قوم

کافر ہے۔ایک متوازی مثال سے اس معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 3348)۔یعنی، جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کیا، اس نے کفر کیا۔ دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں— بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 82)۔یعنی، بندے اور شرک وکفر کے درمیان فرق نماز چھوڑنے سے ختم ہوجاتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان جان بوجھ کر مسلسل نماز ترک کرے تو وہ شریعت کے مطابق کافر ہوجاتا ہے۔اس حدیث کو لے کر کوئی مصلح اگر یہ کرے کہ وہ عمومی طور پر ترغیب وترہیب کے انداز میں مسلمانوں کو نماز کی طرف متوجہ کرے اور ترک صلاۃ کی وعید بتائے تو اس کا ایسا کرنا بالکل جائز ہوگا۔لیکن اگر کوئی مصلح ایسا کرے کہ وہ نماز نہ پڑھنے والے مسلمانوں کی نام بنام ایک فہرست تیار کرے اور اس فہرست کو لے کر مشخص طور پر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں مسلمان ترک صلاۃ کی بنا پر کافر ہوچکے ہیں تو اس کا ایسا کرنا بالکل غلط ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح کوئی داعی یا مصلح قرآن کی آیتوں کو لے کر یہ مسئلہ بیان کرسکتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا ارتکاب کرنے سے کوئی شخص اللہ کی نظر میں کافر ہوجاتا ہے۔لیکن اس کا ایسا کرنا اپنی حد سے تجاوز ہوگا کہ وہ غیر مسلم افراد یا گروہوں کے نام لے کر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں غیر مسلم لوگ کافر ہیں۔

اس معاملہ میں فعل اور فاعل کے درمیان فرق کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ وہ مشخص طور پر فاعل کا اعلان کرے۔ اللہ تعالی نے یہ اعلان صرف ایک بار قدیم منکرین قریش کے بارے میں کیا ہے جن کے اوپر پیغمبر نے براہ راست اتمام حجت کیا تھا۔ بقیہ انسانوں کے بارے میں وہ آخرت میں اعلان فرمائے گا۔ ہمارا کام صرف دعوت دینا ہے، نہ کہ لوگوں کے کافر ہونے کا اعلان کرنا۔

کریڈٹ کا مسئلہ

کافر یا منکر کا لفظ بیک وقت دو کردار سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک وہ جس نے کوئی بات پیش کی ہو۔ دوسرا وہ جس نے اس پیش کی ہوئی بات کا انکار کیا ہو۔ ان میں سے ایک کردار کو داعی کہہ سکتے ہیں دوسرے کردار کو مدعو کہہ سکتے ہیں۔

کافر ایک انفرادی کردار ہے، کافر کسی گروہ کا قومی لقب نہیں۔ کسی گروہ کا کافر قرار پانا ایک بے حد غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کا مطلب ایک کو انکار کی بنا پر ڈس کریڈٹ (discredit) کرنا اور دوسرے کو اس کے دعوتی عمل کی بنا پر کریڈٹ دینا ہے۔ اس کریڈٹ اور ڈس کریڈٹ کا یہ معاملہ فتویٰ یا بیان کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ دعوتی محنت کا طالب ہے۔

اس دعوتی محنت کا معیاری نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیرہ سالہ مکی دور ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ کے لوگوں میں دعوتی کام کا آغاز کیا تو آپ کے خطاب کے الفاظ یہ تھے: یٰاَیُّھَا الْاِنْسَان اس طرح تیرہ سال لوگوں کو

بحیثیت انسان خطاب کرنے کے بعد جب لوگ جان بوجھ کر انکار پر قائم رہے تو آخر میں قرآن کی یہ آیت اتری: قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ۔ اس وقت بھی یہ ایک براہ راست خدائی اعلان تھا، نہ کہ خود پیغمبر کا اپنا خطاب۔ اس اصول کے مطابق ہندستان کے ہندو یا دوسرے ملکوں کے غیر مسلم کی حیثیت اسلامی نقطۂ نظر سے صرف انسان کی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی کافر یا کفار نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ہندوؤں اور موجودہ زمانہ کے دوسرے غیر مسلموں پر یہ ضروری شرط پوری نہیں ہوئی کہ انہیں مکّی معیار کی تیرہ سالہ دعوت دی جائے اور وہ پھر بھی انکار کریں۔ اسی طرح انہیں منکر قرار دینا بھی درست نہیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو نزاعات ہیں اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے بارے میں جو شکایتیں ہیں وہ سب کی سب قومی اور مادّی ہیں۔ یہ تمام تر اسی طرح کے دنیاوی جھگڑے ہیں جو خود غیر مسلم گروہوں میں ایک دوسرے کے خلاف پیش آتے ہیں۔ ان نزاعات کو کافر اور مسلم کے درمیان دینی نزاع نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کو دو گروہوں کے درمیان دنیوی نزاع کہا جائے گا۔ ان قوموں پر اتمام حجت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان ان سے ان دنیوی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں۔

کفر کا تحقق

کسی شخص کے بارے میں کب یہ متحقق (establish) ہوگا کہ وہ منکر یا انکار کرنے والا بن چکا ہے۔ اس سوال کا جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ جیسا

کہ معلوم ہے قرآن کے نزول کا آغاز 610ء میں مکہ میں ہوا۔ پیغمبر اسلام ﷺ قرآن کے ذریعہ مکہ کے لوگوں تک توحید کی دعوت پہنچاتے رہے۔ اس دعوتی مہم میں آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے مخاطبین کو کافر کہہ کر خطاب کریں۔ اس دوران میں جو آیتیں اتریں ان سب میں انسان جیسے الفاظ تھے۔ آپ نے انہیں اپنی قوم کا حصہ قرار دیتے ہوئے اپنا پیغام پہنچایا۔

دعوت کی یہ مہم آپ نے اس طرح چلائی کہ آپ گہرے طور پر ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ نے ان کی ایذاؤں پر یک طرفہ صبر کیا۔ آپ نے ان سے کسی بھی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ آپ نے ان سے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے آپ کے اور ان کے درمیان مادی نوعیت کا کوئی نزاع قائم ہو جائے۔ آپ یک طرفہ طور پر ہمیشہ ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ کو ان کی طرف سے طرح طرح کی مصیبتیں پہنچیں مگر آپ ہمیشہ ان کے لیے دعا کرتے رہے۔

دعوت کی یہ صبر آزما جدو جہد تیرہ سال تک چلتی رہی۔ تیرہ سال کے بعد بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زبان سے ان کے لیے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ آخر میں اللہ تعالی کی طرف سے یہ آیت اتری کہ: قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ (تم کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سال کی جدو جہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ مخاطبین کا انکار ثابت ہو جائے اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اے انکار کرنے والو۔ اس قسم کے دعوتی کورس سے پہلے کسی کو منکر یا کافر قرار دینا جائز نہیں۔ اب

جب کہ پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سالہ جدوجہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ کسی کو کافر یا منکر قرار دیا جاسکے تو عام لوگوں کے لیے تو ایک سو تیرہ سال کی مدت بھی اس کام کے لیے ناکافی ہوگی۔

کفر کی اصطلاح

مکّی دور میں قرآن میں بعض ایسی آیتیں اُتریں جن کا تعلق بیرون عرب کے غیر مسلموں سے تھا۔ مثلاً قرآن کی سورہ نمبر 30 کے آغاز میں رومیوں (عیسائیوں) کا ذکر ہے، جو وقتی طور پر ایرانیوں سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مگر آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ: غُلِبَتِ الْكُفَّارُ فِي أَدْنَى الأَرْضِ (روم کے کفار جو مغلوب ہو گئے ہیں)۔ بلکہ یہ فرمایا کہ: غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ (30:2-3)۔ یعنی، رومی جو مغلوب ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سورہ نمبر 105 میں یمن کے غیر مسلم حاکم ابرہہ کا ذکر ہے۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر یمن کے ایک کافر حکمراں کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ اصحابِ فیل کے لفظ سے اس کا ذکر کیا گیا۔

قدیم مکہ کے منکرین کے لیے قرآن میں کفر اور کافر کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ اس کے بعد اس زمانے کے اہل اسلام تمام غیر مسلموں کو کافر کے لفظ سے پکارنے لگیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم مدینہ آئے تو انھوں نے یہاں کے لوگوں کو کافر کے لفظ سے خطاب نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یثرب پہنچ کر وہاں

کے لوگوں کو جو پہلا خطاب کیا۔ اس میں آپ نے انہیں — أَيُّهَا النَّاسُ، اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ (اے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو) کے لفظ سے خطاب کیا، اسی طرح مدینہ کے باہر ملک کے اطراف میں بہت سے غیر مسلم قبیلے موجود تھے۔ مگر ان کو بھی کافرانِ عرب یا کافر قبائل کا نام نہیں دیا گیا۔ بلکہ ان کے معروف نام سے انہیں پکارا گیا۔ مثلاً اہلِ ثقیف، اہلِ نجران اور اہلِ بحرین وغیرہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دورِ اول میں اہل اسلام جب عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف مذہب کے ماننے والے لوگ آباد تھے۔ دورِ اول کے مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا کہ ان غیر مسلموں کو کافر کے نام سے پکاریں۔ انہوں نے ہر ایک کو اس کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارا۔ مثلاً شام کے مسیحیوں کو مسیحی کہا، فلسطین کے یہودیوں کو یہودی کہا، ایران کے مجوسیوں کو مجوسی کہا، افغانستان کے بودھوں کو بودھ (بوذیّ) کہا، وغیرہ۔

اسی طرح دورِ اول کے یہ مسلمان جب ہندستان آئے تو یہاں بھی انہوں نے یہی کیا۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو ہندو کہا جو سندھو کا عربی تلفظ ہے۔ ابوالریحان البیرونی (وفات 1048ء) نے ہندستان کا سفر کیا۔ اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندستان کے بارے میں ایک عربی کتاب ''تاریخ الہند'' لکھی۔ اس میں وہ یہاں کے غیر مسلموں کو ہندو کہتا ہے، نہ کہ کافرانِ ہند۔

ہزار سال سے زیادہ مدت تک یہی رواج باقی رہا۔ اب بھی کثرت سے ہندستان اور پاکستان کے علاوہ بقیہ دنیا میں یہی رواج بالفعل قائم ہے۔ مسلمان امریکا اور یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ وہاں ان کا سابقہ غیر مسلم قوموں سے پڑتا ہے۔ مگر ہر ایک کو وہ ان کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارتے ہیں وہ انہیں کافر یا کفار نہیں کہتے۔

چند تاریخی مثالیں

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن میں ایہا الکافرون کے انداز میں خطاب کی مثال صرف منکرین مکہ کے لیے آئی ہے، اور وہ بھی تیرہ سال کے پیغمبرانہ اتمام حجت کے بعد۔ منکرین مکہ کے سوا کسی اور کو اس طرح مشخص (specific) انداز میں خطاب نہیں کیا گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو ابتدائی دور میں آپ نے اس طرح خطاب نہیں کیا کہ یَا أَیُّھَا الْکُفَّارُ (اے منکرو)۔ بلکہ قرآن میں یہ آیت اتری: يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (82:6)۔ یعنی، اے انسان، تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہجرت کے بعد صحیفہ مدینہ کا ایک جملہ یہ تھا: لِلْیَھُودِ دِینُھُمْ وَلِلْمُسْلِمِینَ دِینُھُمْ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 503)۔ یعنی، یہود کے لیے یہود کا دین اور مسلمانوں کے لیے مسلمان کا دین۔ ایسا نہیں

ہوا کہ لکھا جائے : لِلْكُفَّارِ دِينُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ (منکرین کے لیے یہ منکرین کا دین اور مسلمانوں کے لیے مسلمان کا دین)۔

فتح مکہ کے بعد عرب کے مشرک قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ سے گفت وشنید کے لیے مدینہ آئے۔ مگر یہاں بھی خطاب کا انداز یہی تھا۔ مثلاً یمن کے لوگ مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا کہ: أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ (مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 586)۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: أَتَاكُمْ كُفَّارُ الْيَمَنِ۔ اسی طرح رسول ﷺ نے اطراف عرب کے حکمرانوں کو دعوتی مکاتیب روانہ کیے ان کا انداز بھی یہی تھا۔ مثلاً آپ نے رومی حکمراں کو جو خط لکھا اس کا پہلا جملہ یہ تھا: مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 4، صفحہ 302)۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں لکھا کہ: إِلَى هِرَقْلَ كَافِرِ الرُّومُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7)۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي رَحْمَةً وَكَافَّةً، فَأَدَّوْا عَنِّي يَرْحَمُكُمْ اللّٰهُ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 607)۔ یعنی، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام دنیا کے لیے رحمت بنایا ہے، تو تم لوگ میری جانب سے اس کو پہنچاؤ اللہ تم پر رحمتیں نازل فرمائے۔ اس میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي كَافَّةً لِلْكُفَّارِ (اللہ نے مجھے تمام منکرین کے لیے مبعوث کیا ہے)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ کی فوج ایران میں داخل

ہوئی تو روایات کے مطابق وہاں ایران کے غیر مسلم حکمراں کو خطاب کرتے ہوئے ایک صحابی نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہا: لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ (تاریخ الطبری، جلد 3، صفحہ 520)۔ یعنی، تا کہ ہم ان انسانوں کو، جو اس کو پسند کریں، انسانوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف لے آئیں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہیں: لَنُخْرِجَ الْكُفَّارَ مِنْ عِبَادَةِ الْكُفَّارِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ (تا کہ ہم ان منکرین کو منکرین کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف لے آئیں)۔

اس طرح دورِ اول کے مسلمان جب عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیلے، تو کسی بھی ملک میں انہوں نے لوگوں کو کافر یا کفار کے الفاظ سے خطاب نہیں کیا، بلکہ ہر قوم کو اسی لفظ سے خطاب کیا جس لفظ کو اس نے خود اختیار کر رکھا تھا۔ مثلاً مسیحی کو مسیحی، یہود کو یہود، مجوس کو مجوس، بودھ کو بودھ وغیرہ۔

کافر کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب کہ متعلقہ شخص کے اوپر کامل اتمام حجت کیا جا چکا ہو اور اس اتمام حجت کا ماڈل صرف ایک ہے۔ اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مکہ کی تیرہ سالہ دعوتی جدو جہد ہے۔ یہ تیرہ سالہ دعوتی عمل ہمیشہ کے لیے دعوت یا اتمام حجت کے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اتمام حجت کے بعد بھی متعین طور پر کسی کے کافر ہونے کا اعلان خدا کی طرف سے ہوگا، نہ کہ داعی کی طرف سے۔

قریش کی مثال

پیغمبر اسلام ﷺ کے سال پیدائش 570 میں ایک بڑا واقعہ ہوا۔ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ مکہ کی طرف اقدام کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کعبہ کو ڈھادے۔ مگر اللہ کی خصوصی مدد کی بنا پر اسے کامیابی نہیں ملی۔ قرآن کی سورہ نمبر 105 میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

610ء جب پیغمبر اسلام ﷺ پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو نزول قرآن کے اس ابتدائی زمانہ میں قرآن کی سورہ نمبر 106 اتری۔ اس سورہ کا ترجمہ یہ ہے: اس واسطے کہ قریش مانوس ہوئے، جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس۔ تو اُن کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔ (106:1-4) اس سورہ میں قریش کو صرف قریش کہا گیا نہ کہ کفار یا کفار قریش۔

پیغمبر اسلام ﷺ توحید کے داعی تھے۔ آپ نے مکہ میں اپنی دعوت شروع کی تو مسلسل تیرہ سال تک اسی انداز میں لوگوں کو پکارتے رہے کہ اے قریش کے لوگو! اے انسانو! اے میری قوم! پُرامن دعوتی مہم کی اس پوری مدت میں آپ نے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ فریق ثانی کی طرف سے ہر قسم کی زیادتیاں کی گئیں۔ لیکن ان کے لیے آپ کی خیر خواہی کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ اُن کی ایذاؤں پر یک طرفہ صبر کرتے ہوئے آپ نے اپنی پرامن دعوتی جدو

جہد جاری رکھی۔ آخر کار تیرہ سال بعد قرآن میں سورہ نمبر 109 اتری۔ اس میں پہلی بار خدا کی طرف سے ان الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ: قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ (109:1)۔ یعنی، کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو۔

اس سے معلوم ہوا کہ کافر (منکر) کا لفظ ایک صفت کو بتاتا ہے، نہ کہ کسی قوم کو۔ اگر کافر سے مراد کوئی قوم ہوتی تو قرآن میں آیت کے الفاظ لِإِيلَٰفِ قُرَيۡشٍ (106:1) — یعنی، قریش کو مانوس کرنے کے لیے — کے بجائے لِإِيلافِ الْكُفَّارِ (کفار کو مانوس کرنے کے لیے) ہونا چاہیے تھا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کافر کا لفظ صفت انکار کو بتانے کے لیے ہے نہ کہ قومی تعلق کو بتانے کے لیے۔ مزید یہ کہ اس بات کا تحقق کہ کسی کے اندر صفت انکار ہے یا نہیں، قیاس کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ حقیقی تجربہ کی بنیاد پر ہوگا۔ اور وہ تجربہ یہ ہے کہ پیغمبر کی سطح پر کم از کم تیرہ سال تک اعلیٰ ترین معیار کی دعوتی جدوجہد چلائی جائے۔ اس کے بغیر خود پیغمبر کے زمانہ میں بھی کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔

مناظرہ

برصغیر ہند میں برٹش حکومت کے زمانہ میں اہل اسلام کے درمیان ایک مبتدعانہ رواج ظہور میں آیا جس کو مناظرہ کہا جاتا ہے۔ ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان دعوت کے بجائے مناظرہ بازی شروع ہوئی جس نے دونوں

فرقوں کے درمیان غیر معتدل فضا پیدا کرنے کا کام کیا۔ مسلمان مناظر نے ہندو کے خلاف کتاب لکھی اور اُس کو کفر توڑ کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد ہندو مناظر نے مسلمانوں کے خلاف کتاب لکھی جو کفر توڑ کا بھانڈہ پھوڑ کے نام سے شائع کی گئی۔

اسلام کا طریقہ دعوت ہے، جو نصح (خیر خواہی) اور شفقت اور یک طرفہ صبر کے اصول پر جاری ہوتا ہے۔ جب کہ مناظرہ (debate) کا مقصد فریق ثانی کو شکست دینا ہوتا ہے۔ مناظر کا نشانہ فریق ثانی کو ہرانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس قسم کی زبان بولتا ہے کہ ان کے اوپر بلڈوزر چلا دو:

Bulldoze them all.

اس سے دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے جو طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

دار الدعوہ

دار الکفر یا بلاد الکفار کے الفاظ عباسی دور میں استعمال کیے گئے۔ اس سے پہلے یہ اصطلاحیں اہل اسلام کے درمیان رائج نہ تھیں۔ میرے نزدیک یہ اضافہ درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ جو ملک اسلامی ملک ہو اس کو دار السلام کہا جائے اور بقیہ تمام ملکوں کو دار الدعوہ کہا جائے۔ دار السلام کے سوا ہر ملک دار الدعوہ ہے خواہ وہ مسلمانوں کے حق میں بظاہر دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی نسبت سے ارشاد ہوا ہے: وَهٰذَا كِتَابٌ

أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا (6:93)۔ یعنی، یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے برکت والی ہے، تصدیق کرنے والی اُن کی جو اس سے پہلے ہیں۔ اور تا کہ تو ڈرائے امّ القری کو اور اس کے آس پاس والوں کو۔

قرآن کی اس آیت میں امّ القری سے مراد مکہ ہے۔ جب یہ آیت اتری، اُس وقت مکہ غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا۔ حتیٰ کہ کعبہ کو بتوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔ مگر اس آیت میں قدیم مکہ کو دار الکفر یا مدینۃ الکفر نہیں کہا گیا بلکہ ام القری کہا گیا اور وہاں انذار، بالفاظ دیگر، دعوت کا حکم دیا گیا۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہو، وہ اسلامی اصطلاح میں دار الدعوہ یا دار الانذار قرار پائیں گے۔ ایسے کسی بھی مقام کے لیے دار الکفر یا بلاد الکفار جیسے الفاظ کا استعمال درست نہ ہوگا۔

کسی ملک کا حوالہ جب جغرافی اعتبار سے دینا ہو تو اس کا ذکر اس نام سے کیا جائے گا جس نام سے وہ عمومی طور پر معروف ہے۔ مثلاً سری لنکا کو سری لنکا اور جنوبی کوریا کو جنوبی کوریا۔ اور جب اہل اسلام کی ذمہ داری کے اعتبار سے کسی ملک کا حوالہ دینا ہو تو اس کو دار الدعوہ کہا جائے گا۔ دار الدعوہ کا لفظ جغرافی تقسیم کو نہیں بتاتا، بلکہ وہ اہل اسلام کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتا ہے (الرسالہ، دسمبر 2003)۔

ٹیلی ویژن کا استعمال

نئی دہلی کے اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے شمارہ اگست 2004ء میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں ٹی وی کے بارے میں دو مختلف فتووں کا ذکر ہے۔ ایک فتوے میں کہا گیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے ٹی وی کا استعمال جائز ہے۔ دوسرے فتوے میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ ٹی وی تفریح کا ذریعہ ہے جس پر فحش پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ دینی پروگرام کے لیے اس کا استعمال ناجائز ہے (صفحہ 1)۔

اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک ایسا کام ہے جو اہل اسلام پر فرض ہے۔ اس کو ہر دور اور ہر حال میں انجام دینا ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ یہ کام اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لوگ موجود ہوں یا اسی ذریعہ سے کیا جائے گا جو لوگوں تک پہنچنے والا ہو۔ کسی الگ تھلگ جزیرہ میں انفرادی طور پر یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں یہ شرط لگانا کہ صرف اسی مقام پر یا اسی ذریعہ سے یہ کام کیا جائے گا جہاں کوئی بُرائی نہ ہو تو اس طرح سرے سے یہ کام ہی انجام نہ پائے گا کیوں کہ دوسرے لوگ کبھی ہماری شرطوں پر ہم کو نہیں مل سکتے۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کو مکہ میں 610ء میں پیغمبری ملی۔ اس وقت وہاں یہ حال تھا کہ کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ گویا کہ کعبہ کو

عملاً بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اس وقت کے مکہ میں کعبہ ہی لوگوں کے لیے مقام اجتماع بنا ہوا تھا۔ مکہ کے لوگ روزانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ مکہ والوں تک دین توحید کا پیغام پہنچانے کے لیے جو قابل حصول مقام تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ جہاں لوگ اپنے بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے تھے۔ کسی اور جگہ ان لوگوں کو پانا ممکن ہی نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاملہ میں ایک حکمت اختیار کی۔ آپ نے بت کے معاملہ کو اور دعوت کے معاملہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے لیا۔ آپ نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جو لوگ وہاں اکٹھا ہوتے ہیں وہ بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ آپ نے اس پہلو کو نظر انداز کر کے اس وقت کعبہ کو صرف مقام اجتماع کے طور پر لیا اور وہاں جا کر وہاں کے موجود لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے اور توحید کا پیغام دینے لگے۔ اس حکمت نبوی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ — مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔

یہی حکمت ہمیں ٹی وی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی دوسرے غیر مطلوب پروگرام جو ٹی وی میں آتے رہتے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے اس کے ذریعہ اپنا دینی پروگرام پیش کرنا۔ کیوں کہ ٹی وی کے عمومی رواج کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہم کو زیادہ سامعین ٹی وی ہی کے ذریعہ مل سکتے ہیں۔ کسی اور ذریعہ سے ہمیں زیادہ سامعین نہیں ملیں گے۔

تاہم اس کا ایک اور پہلو ہے۔ اس کا تعلق ان پروگراموں سے ہے جو آج کل اسلامی پروگرام کے نام پر ٹی وی میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام عملاً زیادہ مفید نہیں۔ ٹی وی کے دوسرے پروگراموں کی طرح ان اسلامی پروگراموں کو بھی تفریح کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ یہ پروگرام بھی اسلام کے نام پر تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ زیادہ تر اسلامی تفریح ہوتے ہیں، نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی پروگرام۔

جو لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ٹی وی کو استعمال کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس اعتبار سے سب سے اچھی مثال مسیحی پروگرام کی ہے۔ اردو اور دوسری زبانوں میں روزانہ مسیحی پروگرام آتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام فنی اعتبار سے ممتاز طور پر بہتر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے ہر مسلم ملک میں اسلامی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ مگر میری معلومات کے مطابق لوگ اس کو بہت کم دیکھتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب ان پروگراموں کا غیر معیاری ہونا ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس کا تجربہ ہوا ہے کہ کسی مسلم ملک میں میرا جانا ہوا۔ وہاں میں نے تحقیق کی کہ وہاں کے ٹی وی پر جو اسلامی پروگرام آتے ہیں، اس کو لوگ کتنا زیادہ دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بہت کم لوگ ٹی وی کے اس اسلامی پروگرام کو دیکھتے ہیں۔ اکثر

مقام پر یہ حال ہے کہ جب ٹی وی پر اسلامی پروگرام آتا ہے تو گھر والے یہ کہہ کر اس کو بند کردیتے ہیں کہ —— اس کو بند کرو یہ تو سرکاری پروگرام ہے۔

برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمان اقبال کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اقبال کا کلام ان لوگوں کے لیے صرف گنگنانے کا نغمہ ثابت ہوا ہے، نہ کہ زندگی کے لیے عملی رہنمائی لینے کا ذریعہ۔ مثلاً اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مگر مسلمانوں، خاص طور پر مذہبی طبقہ کا یہ حال ہے کہ وہ ہر نئی چیز پر بھڑکتے ہیں۔ وہ ہر نئی چیز پر منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ٹی وی ہے۔ مذہبی طبقہ کے درمیان ٹی وی کو اتنا ہی بُرا سمجھا جاتا ہے جتنا کہ شیطان کو۔

اس معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ٹی وی اور ٹی وی کے غلط استعمال کے درمیان فرق کیا جائے۔ ٹی وی تو ایک خدائی قدرت کا ظہور ہے۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری قانون کا استعمال ہے۔ ٹی وی کا طریقہ امکانی طور پر خود خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں چھپا ہوا تھا۔ انسان کا حصہ اس میں صرف اتنا ہے کہ اس نے اس کو دریافت کر کے اسے استعمال کیا۔ ٹی وی کی ٹیکنالوجی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کا عطیہ ہے، نہ کہ کسی دشمنِ اسلام کا۔

یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ ٹی وی پر بہت سے غیر اخلاقی پروگرام آتے ہیں۔مگر یہ ٹی وی کا غلط استعمال ہے۔اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ غلط استعمال ہر چیز کا ہوسکتا ہے۔حتیٰ کہ ثابت شدہ طور پر مقدس چیزوں کا بھی۔غلط استعمال کی بنا پر کسی چیز کو چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ اس کے استعمال کو درست کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ منفی ردعمل ظاہر کر کے الگ ہو جائے۔اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ایک مثبت ذمہ داری ہے۔اور یہ کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ٹی وی کے طریقہ کو فنی طور پر سمجھیں۔وہ اس کے استعمال کی تفصیلات کو جانیں۔وہ یہ دریافت کریں کہ ٹی وی کو کس طرح اصلاحی کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پھر مذہبی طبقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ضروری تیاری کے بعد ٹی وی کے لیے اعلیٰ درجہ کے اسلامی پروگرام تیار کرے،ایسا پروگرام جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔جس کو دیکھنے کے لیے لوگ راغب ہوں۔جو آج کے انسان کے ذہن کو ایڈرس کرے۔

اسلام کا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہے بلکہ منفی حالات میں مثبت پہلو تلاش کرنے کا طریقہ ہے۔اس کی ایک مثال قدیم کعبہ کی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔یہاں ہر عورت اور مرد کو آزادی دی گئی ہے۔اس لیے یہ ناممکن ہے کہ موجودہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک

رہے۔ کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آئے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ناموافق حالات موجود رہیں گے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ناموافق حالات کے درمیان موافق پہلو کو دریافت کریں اوراس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:6)۔ یعنی جہاں مسائل ہیں، وہیں مواقع بھی موجود ہیں۔ تم مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ یہ ایک آفاقی حکمت ہے۔ اس حکمت کا تعلق ٹی وی سے بھی ہے اور دوسری تمام چیزوں سے بھی (الرسالہ، دسمبر 2004)۔

غلو کی حقیقت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: دین میں غلو سے بچو (إیّاکُم والغُلوّ)۔ کیونکہ تم سے پہلے جو لوگ تھے، وہ دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئے (مسند احمد، حدیث نمبر 3248)۔ غلو کا لفظی مطلب انتہا پسندی (extremism) ہے۔ انتہا پسندی ہمیشہ تباہی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک ہے بنیادی حصہ (basics)، اور دوسرا ہے جزئی حصہ (non-basics)۔ دین کے بنیادی حصے پر اگر زور دیا جائے تو اس سے دین میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوگی۔ لیکن جب دین کے غیر

بنیادی حصہ پر زیادہ زور دیا جانے لگے تو اسی سے غلو پیدا ہوتا ہے، اور تباہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مثلاً دین میں اصل اہمیت روح (spirit) کی ہے، اور اس کا جو فارم (form) ہے، وہ اصل کے مقابلے میں جزئی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً نماز میں خشوع کی حیثیت بنیادی ہے، اور نماز کا جو فارم ہے، وہ اس کے مقابلے میں غیر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نماز کے فارم پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگے، اور اسی پر نماز کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار قرار پائے تو یہ غلو ہوگا۔ اس غلو کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ نماز کے فارم پر تو بہت زیادہ دھیان دیں گے، لیکن نماز کی روح ان کے یہاں عملاً غیر اہم بن جائے گی۔ اسی شدت پسندی کو حدیث میں ہلاکت کہا گیا ہے۔

دین کی روح ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ البتہ دین کے فارم میں فرق ہوتا ہے۔ دین کی روح پر اگر زور دیا جائے تو اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس کے فارم پر زیادہ زور دیا جانے لگے تو فرقے پیدا ہوجائیں گے۔ کیوں کہ روح میں یکسانیت ممکن ہے، لیکن فارم کے معاملے میں یکسانیت ممکن نہیں۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ فارم کے معاملے میں تعدد (diversity) کے اصول کو مان لیا جائے۔ یعنی یہ بھی درست اور وہ بھی درست۔ مثلاً نماز میں آمین بالسر بھی درست اور آمین بالجہر بھی درست۔ مصافحہ میں، ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی درست اور دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی

درست، وغیرہ۔ اگر فارم میں تعدد کے اصول کو مان لیا جائے تو دین میں کبھی فرقہ بندی نہیں ہوگی (الرسالہ، اپریل 2017)۔

غلو نہیں

قرآن (4:171) میں اہل کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنے دین میں غلو نہ کرو (لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ)۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ تم لوگ دین میں غلو سے بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں: إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّينِ (مسند احمد، حدیث نمبر 1851)۔

غلو کا مطلب ہے زیادہ ہونا، حد سے تجاوز کرنا۔ حدیث کے مطابق، ہر قسم کے معاملات میں توسط اور اعتدال کی راہ ہی درست راہ ہے۔ اعتدال یا میانہ روی کا طریقہ ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور غلو کا طریقہ ہمیشہ نقصان اور ناکامی کی طرف۔ یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ اسی لیے عالمی سطح پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ زیادتی ہر چیز میں بری ہے:

An excess of everything is bad.

غلو کا تعلق ہر معاملہ سے ہے۔ مثلاً عقیدہ میں پختہ ہونا بہت اچھی بات ہے مگر عقیدہ کے کھلے اظہار میں اگر جان کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں اپنی جان

بچانے کے لیے اخفا کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز اور روزہ، ذکر اور تلاوت قرآن، سب مطلوب اعمال ہیں۔ مگر ان کی غیر معتدل کثرت مطلوب نہیں۔ امر بالعروف اور نہی عن المنکر بلا شبہ ضروری اعمال میں سے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کو تشدد کی حد تک لے جائے تو وہ درست نہ ہوگا۔

یہی معاملہ اخلاقی اصولوں کا بھی ہے۔ مثلاً خود اعتمادی ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے۔ لیکن خود اعتمادی اگر کسی کو غیر حکیمانہ اقدام تک لے جائے تو وہ پسندیدہ نہ ہوگا۔ عزتِ نفس اور خودداری بلا شبہ پسندیدہ اعمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر عزتِ نفس کسی کو اس حد تک لے جائے کہ وہ اس کے لیے اپنی غلطی کے اعتراف میں رکاوٹ بن جائے تو وہ بھلائی نہیں رہے گی بلکہ ایک برائی بن جائے گی۔

اسی طرح یہ ایک اچھی صفت ہے کہ آدمی کسی کی مدد نہ لے، وہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرے۔ وہ اپنی کفالت آپ کرنا چاہے۔ لیکن کسی کا یہ مزاج اگر اس کے اندر فخر اور بڑائی کا جذبہ پیدا کرنے کا سبب بن جائے تو یہ اس کے حق میں ایک بری عادت ہوگی، نہ کہ کوئی اچھی عادت۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہے، اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے —— اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دیدے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیے جائیں تو اس میں مبالغہ کر کے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنا دیا جائے۔

اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی تعلیم کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے تو وہ غلو کی فہرست میں شامل ہوگا (الرسالہ، جنوری 1999)۔

دین میں غلو

اسلام میں جو چیزیں منع ہیں، ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو غلو کہا گیا ہے۔ یعنی حد سے تجاوز کرنا۔ غلو کا یہ فعل ہمیشہ دینی معاملات میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں نصاریٰ کو غلو سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (5:77)۔ یعنی، اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

یہ نہیں فرمایا کہ: لا تُغْلِوا فِي كُفْرِكُمْ (اپنے کفر میں غلو نہ کرو)۔

میرے ہم وطنوں میں ایک صاحب تھے۔ ان کا نام قمر الدین تھا۔ بہت مخلص آدمی تھے۔ نماز روزہ کے حد درجہ پابند تھے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے لیے وقت پر مسجد پہونچنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔ اس کی وجہ "شرعی غسل" کے بارے میں ان کا انتہا پسندانہ تصور تھا۔ جمعہ کے دن وہ نہانا شروع کرتے تو بار بار انہیں شبہ ہو جاتا کہ ان کا غسل مکمل نہیں ہوا۔ فلاں جگہ کے بال تک پانی نہیں پہونچا۔ جسم کا فلاں حصہ دھونے سے رہ گیا۔ چنانچہ وہ گھنٹوں غسل خانہ میں نہاتے رہتے۔ بعض اوقات یہ مدت اتنی لمبی اور اتنی تکلیف دہ ہو جاتی کہ غسل کے عمل میں حوض کے پانی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے آنسو بھی شریک ہو جاتے۔

یہ ایک غیر ضروری قسم کا شک تھا۔ شریعت کی نظر میں یہ غلو ہے، نہ کہ اسلامی احتیاط۔ غلو کی یہ برائی ہمیشہ دینی جذبہ کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اپنے انجام کے اعتبار سے وہ دین کی ضد بن جاتی ہے۔ ابتدائی نیت کے اعتبار سے وہ بظاہر معصوم ہوتی ہے مگر عملی صورت اختیار کرنے کے بعد غیر معصوم۔

اللہ کی عبادت کرنا اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن اگر کوئی عبادت گزار مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے یا ہر رات کو سارا قرآن ختم کرنے لگے تو اس طرح کا فعل عبادت میں غلو بن جائے گا۔

اسلام میں غیرت مندی کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کی غیرت اگر اس حد تک بڑھے کہ اس کو اپنے خلاف سچائی کے اعتراف میں بھی غیرت آنے لگے تو ایسی غیرت غلو کی فہرست میں شامل ہو جائے گی۔ اسلام میں اہل علم کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ لیکن اگر اہل علم کے احترام کا مطلب یہ لیا جائے کہ اہل علم پر تنقید نہ کرو تو یہ غلو بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دینی جذبہ کسی عمل کو دینی نہیں بناتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل خدا کے حکم اور رسول کے نمونہ کے مطابق ہو (الرسالہ، اپریل 1987)۔

جوابی مذہبیت

مئی 1922 کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہیے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لیے حاصل کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقتاً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے، نہ کہ حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے، نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جغرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لیے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں — ایسی تمام کارروائیاں بلا شبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پاتی ہوں۔ اس کا رُکنا خدا کے لیے ہوتا ہو اور آگے بڑھنا خدا کے لیے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کشمکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسنِ خاتمہ تک نہ پہنچے (الرسالہ، جنوری 1983)۔

عمر ضائع کردی

1330ھ میں رشید رضا مصری (1935-1865) ہندستان آئے تھے۔ وہ دار العلوم دیو بند گئے۔ وہاں ان کے خیر مقدم کے لیے ایک جلسہ ہوا۔ اس موقع پر موصوف نے دار العلوم کے ایک استاد سے پوچھا کہ یہاں حدیث کے درس کا طریقہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب حدیث پڑھی جاتی ہے تو محدث پہلے اس کے علمی نکات کو بیان کرتا ہے۔ اگر بادی الرائے میں حدیث امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے خلاف ہوتی ہے تو محدث حنفی مسلک سے اس کی مطابقت ثابت کرتا ہے۔ رشید رضا نے یہ سن کر کہا، کیا یہی تمام احادیث میں ہوتا ہے۔ کہا گیا ہاں، انھیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مولانا محمد یوسف بنوری (1977-1908) کی روایت کے مطابق، انھوں نے کہا: هَلِ الحَدِيثُ حَنَفِيٌّ، وَكَيْفَ يُمكِنُ ذٰلِكَ، وَهَلْ هٰذَا إِلَّا عَصَبِيَّةٌ مَالَهَا مِن سُلطَانٍ (کیا حدیث بھی حنفی ہے، ایسا کس طرح ہو سکتا ہے، یہ تو محض عصبیت ہے، جس کے لیے کوئی دلیل نہیں)۔ مولانا انور شاہ کشمیری (1934-1875) اس زمانے میں دار العلوم میں حدیث کے استاد تھے۔ انھیں یہ خبر پہونچی تو انھوں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس کو اپنا موضوع بنایا اور "ثابت" کر دیا کہ تمام حدیثیں فقہ حنفی کے مطابق ہیں (نفحۃ العنبر، صفحہ 71-70)۔

تاہم انور شاہ کشمیری کو آخر عمر میں اس طریقِ تعلیم کی خامی کا احساس ہو گیا تھا۔ موصوف کے شاگرد مولانا مفتی محمد شفیع (1897-1976) ناقل ہیں کہ مولانا کشمیری نے ان سے کہا:

ہماری تمام کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کریں... مگر کیا حاصل ہے اس کا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطا (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطا محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں... ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ درست ہو۔ قبر میں منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی... جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے، نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی... اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، جس کی دعوت انبیائے کرام لے کر آئے تھے ... آج وہ دعوت تو نہیں دی جا رہی... ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔

(وحدتِ امت از مفتی محمد شفیع، لاہور، 1997، صفحہ 15-13) بحوالہ تجدید دین۔

سوال وجواب

سوال

آج مسلمانوں میں ایسی جماعتیں اور گروہ موجود ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں توحید پر زور زیادہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا جماعت اور تنظیم توحید کے اتفاقی مسئلہ پر اٹھانی چاہیے اور یہ تنظیمیں اور جماعتیں اپنے زعم کے مطابق توحید کے اتفاقی مسئلے پر کام کر رہی ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی تمام توحید والی آیتوں کو عوام کے سامنے پیش کر کے کہتے ہیں کہ اے لوگو! توحید کو اختیار کرو اور شرک کو چھوڑو۔ اس کائنات میں کوئی داتا، دستگیر، حاجت روا، مشکل کشاہ اور غوث الاعظم وغیرہ نہیں، سوائے مالک کائنات کے۔ اس طرح یہ لوگ قرآن کی تمام ان آیتوں کو جن میں شرک کی مذمت بیان ہوئی ہے پیش کر کے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کلمہ پڑھنے والے شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم موحد لوگ اُن قبر پرستوں (بریلیوں اور شیعوں وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

مسلمانوں کے اس طرح کے دعووں کو سامنے رکھتے ہوئے چند سوالات پیش خدمت ہیں۔ امید ہے آپ تسلی بخش جواب دیں گے۔

1) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر شرک ہوتا رہے تو کیا ایسے شخص پر مشرک کا اطلاق ہوگا؟

2) مسلم اور مشرک کی تعریف کیا ہے؟ کیا مسلمان مشرک ہوسکتا ہے؟

3) مسلمانوں میں جو لوگ واضح شرک کرتے ہیں ان کی اقتدا میں صلوٰۃ پڑھنے کی کیا دلیل ہے جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرک کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔

4) جب مشرک امام کی اپنی صلوٰۃ نہیں ہوتی تو موحد مقتدی کی نماز کیسے ہوگی؟

5) امت مسلمہ کے بہت سے علما اس بات کے قائل ہیں کہ سورہ یوسف کی آیت 106 کی روشنی میں کلمہ پڑھنے والے بھی مشرک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

6) جب شراب کا پینے والا شرابی کہلائے گا تو شرک کرنے والا مشرک کیوں نہیں کہلایا جائے گا؟

7) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر ایک ہندو مندر جاتا ہے تو یہ کام اس کے مسلمان ہونے میں رکاوٹ ہوگا اور اسے بدستور ہندو سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر دوسرا شخص کلمہ کا اقرار کرنے کے بعد قبر کا طواف کرتا رہے تو یہ عمل

اس کے اسلام میں رکاوٹ کیوں نہیں بنے گا اور ایسا شخص مشرک کیوں نہیں ہوگا۔

8) آپ کے لٹریچر اور کتابوں میں میں نے قبر پرستی اور شرک کے پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور نہیں دیکھا جتنا زور توحیدی ٹائپ کے لوگ لگاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ آپ بھی شرک کے مخالف ہیں، بلکہ سخت ترین مخالف۔

(عبداللطیف، کراچی، پاکستان)

جواب

اختلاف کی برائی جو موجودہ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ مسلم جماعتیں توحید کے بجائے کسی اور عنوان پر کام کررہی ہیں۔ اختلاف کا اصل سبب صرف ایک ہے اور وہ انتہا پسندی (extremism) ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتیں کسی نہ کسی پہلو سے انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کوئی اعتقادی انتہا پسندی کا شکار ہے کوئی سیاسی انتہا پسندی کا کوئی مسائلی انتہاپسندی کا کوئی گروہی انتہاپسندی کا، کوئی کسی اور انتہا پسندی کا۔ یہی انتہا پسندی موجودہ نزاعات کا اصل سبب ہے۔ انتہا پسندی کو قرآن اور حدیث میں غلو کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وَإِيَّاكُمْ

وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّينِ (**مسند احمد**، **حدیث نمبر** 1851، **سنن ابن ماجہ**، **حدیث نمبر** 3029)۔ یعنی تم غلو سے بچو کیوں کہ پچھلی امتیں غلو ہی کی سبب سے ہلاک ہوئیں۔

غلو یا انتہا پسندی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی بات کو اس کی آخری منطقی حد (logical extreme) تک لے جایا جائے۔ اور پھر اس کی بنیاد پر انتہائی احکام صادر کیے جائیں۔ اس کی ایک مثال خود آپ کی زیر نظر تحریر میں موجود ہے۔ توحید پر زور دینا بہت اچھا ہے۔ مگر یہ کہنا اتنا ہی غلط ہے کہ یہ کلمہ پڑھنے والے مسلمان چونکہ شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم موحد لوگ ان قبر پرستوں (بریلویوں اور شیعوں وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوں گے۔

اسی آخری بات کو حدیث میں غلو کہا گیا ہے اور غلو خود ایک ہلاکت خیز عمل ہے۔ ایک شخص کو علم دین حاصل ہو اور علم دین کی روشنی میں اس نے یہ جانا ہو کہ توحید اسلام میں بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے تو ایسے شخص کو حق ہے کہ وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت لوگوں کو توحید کی طرف بلائے۔ لیکن اس اصلاحی دعوت کے ساتھ اگر وہ یہ حکم لگانے لگے کہ

فلاں لوگ چونکہ اس کے نزدیک مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہیں اس لیے ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی تو ایسا شخص خود اسلام کی نظر میں غلط کار قرار پائے گا کیونکہ وہ غلو کر رہا ہے اور غلو کی اسلام میں گنجائش نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا کام ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کی ناگزیر شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مصلح ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ اس کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری صرف پُرامن دعوت ہے یہ اس کی سرے سے ذمہ داری ہی نہیں کہ وہ متعین طور پر لوگوں کے بارے میں یہ حکم لگائے کہ فلاں شخص مشرک ہے۔ مصلح کو چاہیے کہ وہ مشرک ہونے کے معاملہ کو خدا کے حوالے کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف خیر خواہانہ نصیحت تک محدود رکھے۔ جن لوگوں کے اندر فرق کرنے کی یہ صلاحیت نہ ہو ان کا اصلاح کے میدان میں آنا بذات خود ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے سوالات کا نمبروار جواب حسب ذیل ہے۔

1) کسی مصلح کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ شرک کے مسئلے کو بتائے۔ کسی مصلح کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی متعین شخص کو مشرک قرار دے اور اس کے اوپر شرک کے احکام نافذ کرنے کی

کوشش کرے۔ پہلا کام یقینی طور پر جائز ہے مگر دوسرا کام یقینی طور پر جائز نہیں۔ جولوگ ایسا کریں وہ مفسد ہیں، نہ کہ مصلح۔

2) مشرک کسی قوم یا نسل کا نام نہیں۔ کسی بھی شخص سے مشرک کا فعل سرزد ہوسکتا ہے۔ مگر تعین کے ساتھ کسی کو مشرک قرار دینے کا حق صرف خدا کو ہے انسان کو نہیں۔

3) کوئی مقتدی امام کی نماز نہیں پڑھتا۔ ہر مقتدی خود اپنی نماز پڑھتا ہے۔ امام کے سبب سے کسی مقتدی کی نماز نہ مقبول ہوتی ہے اور نہ غیر مقبول۔ قبولیت کا تعلق تمام تر ہر آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ باجماعت نماز کا مقصد صرف اجتماعیت ہے۔ جس امام کے پیچھے بھی اجتماعیت کا یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ درست قرار پائے گا۔ یہ بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: الصَّلَاةُ الْمَكْتُوبَةُ وَاجِبَةٌ خَلْفَ كُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا كَانَ أَوْ فَاجِرًا وَإِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ (سنن ابوداود، حدیث نمبر 594)۔ یعنی، فرض نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد اور خواہ اس نے کبیرہ گناہ کیا ہو۔

یہاں اگر کوئی یہ نکتہ نکالے کہ حدیث میں فاجر یا مرتکب کبائر کا لفظ ہے اس میں مشرک کا لفظ نہیں تو یہ بھی اسی غلو کی ایک صورت ہو گی

جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس قسم کے غلو کرنے والوں پر فرض ہے کہ وہ چپ رہیں، نہ کہ اس قسم کے فتنہ انگیز الفاظ بول کر امت میں نزاع پیدا کریں۔

4) کس مصلی کی نماز ہوئی اور کس مصلی کی نماز نہیں ہوئی، اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمام تر اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جو لوگ کسی مصلی کی نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگائیں وہ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور حد سے تجاوز کرنا بلاشبہ سخت گناہ ہے۔

5) کلمہ پڑھنا صرف اسلام میں داخلہ کا اعلان ہے۔ کلمہ کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی شرک کے ارتکاب سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ فتنہ کی اس دنیا میں کوئی بھی شخص شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مصلح کا کام مشرک کی نشاندہی کرنا اور اس پر حکم لگانا نہیں ہے بلکہ عمومی انداز میں شرک کا مسئلہ بتانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کو جب اصلاحی خطاب کرنا ہوتا تو آپ فرماتے: مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَفْعَلُونَ كَذَا (رسائل ابن حزم، جلد 1، صفحہ 383)۔ یعنی، لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایسا اور ایسا کرتے ہیں۔

6) ایک شخص اگر شراب پیتا ہو تو مصلح کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے شرابی

ہونے کا اعلان کرے اور اس کو کوڑا مارنے کا فتوی دے۔ مصلح کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کامل خیر خواہی کے ساتھ شرابی کو نصیحت کرے اور برابر نصیحت کرتا رہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بظاہر شرک میں مبتلا ہے تو مصلح کو چاہیے کہ وہ خیر خواہانہ انداز میں اس کو سمجھائے۔ مصلح کو اس کا حق نہیں کہ وہ برسر عام تعین کے ساتھ کسی کے مشرک ہونے کا اعلان کرے اور اس کے خلاف فتویٰ جاری کرے۔ یہ سب دینی اصطلاح میں غلو کے کام ہیں اور اسلام میں غلو کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

7) اس معاملے میں مسلم اور نو مسلم دونوں کا حکم ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اصلاح کی ہمدردانہ کوشش دونوں کے ساتھ کی جائے گی۔ مگر تعین کے ساتھ شرعی حکم لگانے کا کام کسی کے خلاف بھی نہیں کیا جائے گا۔

8) پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ سارا زور روح دین کو زندہ کرنے پر لگایا جائے۔ خارجی اعمال ہمیشہ داخلی روح کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ خارجی اعمال سے اپنے آپ داخلی روح پیدا ہو جائے۔

تکفیر و تفسیق کا موجودہ طریقہ جو مسلمانوں میں ایک عرصہ سے رائج ہے وہ سراسر باطل ہے شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذموم طریقہ عباسی سلطنت کے زمانے میں رائج ہوا اور ”فرق ضالّہ“ کے نام پر وہ کئی سو سال

تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آ گئی کہ ان فتووں کے مطابق امت مسلمہ میں کوئی بھی شخص مومن ومسلم کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ آخر کار علما نے اتفاق عام کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ تکفیر وتفسیق کے اس کام کو بند کر دیا جائے۔ علما نے اتفاق رائے کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ: لَا نُکَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ (ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے)۔

یہی اس معاملہ میں صحیح مسلک ہے۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں اس قسم کا تکفیری مشغلہ نہیں ملتا۔ تکفیری مشغلہ عباسی دور میں قدیم عراق میں متکلمین نے پیدا کیا۔ مگر بعد کو علمائے راسخین نے اس کو ردّ کر دیا اور یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ کسی بھی حال میں اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اہل قبلہ کی شرط اس قسم کی ایک چیز ہے جس کو تعلیق بالمحال (a condition that can never occur) کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی فرقہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ کعبہ کے بجائے کسی مندر یا چرچ کی طرف نماز پڑھے۔ پچھلے ہزار سال کے دوران کبھی کسی فرقہ نے ایسا نہیں کیا۔ ایسی حالت میں لَا نُکَفِّرَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہے ہم بھی اس کو مسلمان کہیں گے۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو کافر نہیں بتائیں گے۔

تکفیر وتفسیق کی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بُرائی کے معاملہ میں لوگوں کو بے عمل یا غیر جانبدار بنا دیا جائے۔ اس کا مطلب عمل کے صحیح رخ کو بتانا ہے۔ اور وہ یہ کہ بُرائی کے معاملے میں ہمارا طریقہ خیر خواہانہ نصیحت کا ہونا چاہیے۔ بقیہ چیزوں کو اللہ کے اوپر چھوڑ دینا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی۔ اور میں نے دعا کی کہ وہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی۔ اور میں نے یہ دعا کی کہ وہ ان کو گروہوں میں نہ بانٹے کہ ان کا ایک گروہ ان کے دوسرے گروہ کو اپنی طاقت کا مزہ چکھائے۔ اللہ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2890)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تحریک کے غیر مطلوب ہونے کی پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ کیا اس تحریک کے ذریعہ مسلمان دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ جب بھی کسی تحریک کا یہ نتیجہ نکلے کہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں تو یقینی طور پر ایسی تحریک ایک غیر مطلوب تحریک ہے۔ اس کو خدا کی مدد حاصل نہیں۔ ایسی تحریک کا اگر پھیلاؤ ہو تو یقینی طور پر یہ پھیلاؤ شیطان کی مدد سے ہوگا، نہ کہ اللہ کی مدد سے۔

دو گروہوں میں بٹنے کا یہ معاملہ سیاسی عنوان سے بھی ہوسکتا ہے اور مذہبی عنوان سے بھی یا کسی اور عنوان سے بھی۔ کسی مسلم تحریک کے مطلوب ہونے کی اصل پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے نام پر اٹھائی گئی ہے۔ بلکہ اصل پہچان یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر اتحاد فروغ پا رہا ہے یا اختلاف۔ جس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں اتحاد فروغ پائے وہ خدا کی مطلوب تحریک ہے اور جس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں تفریق واختلاف فروغ پائے وہ خدا کے نزدیک غیر مطلوب تحریک ہے۔ (الرسالہ، مئی 2003)

بیک کور ٹیکسٹ

تکفیر وتفسیق کا موجودہ طریقہ جو مسلمانوں میں ایک عرصہ سے رائج ہے وہ سراسر باطل ہے، شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذموم طریقہ عباسی سلطنت کے زمانے میں رائج ہوا اور ''فرق ضالّہ'' کے نام پر وہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آ گئی کہ ان فتووں کے مطابق امت مسلمہ میں کوئی بھی شخص مومن ومسلم کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ آخر کار علما نے اتفاق عام کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ تکفیر وتفسیق کے اس کام کو بند کر دیا جائے۔ علما نے اتفاق رائے کے ساتھ یہ اعلان کیا: لَا نُكَفِّرَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ (ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے)۔